شہزاد احمد کی نظموں کا فکری و فنّی مطالعہ

ایم فل اُردو

سیشن: ۲۰۲۳ء-۲۰۲۱ء

مقالہ نگار:

علیم مختار

رولنمبر:۰۷

رجسٹریشن نمبر: 2019-GCWUF-0843

نگرانِ مقالہ:

بازغہ قندیل

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو

گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی، فیصل آباد

شعبۂ اُردو

گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی فیصل آباد

اگست ۲۰۲۳ء

تفصیل ابواب

بابِ اوّل

شہزاد احمد ــــ احوال و آثار

(الف) سوانحی کوائف

(ب) ادبی کوائف

باب اوّل

شہزاد احمد ___ احوال و آثار

سوانحی کوائف

کوئی بھی فرد شخصیت کی تکمیل کے مراحل میں باقاعدہ کسی پس منظر کا حامل ہوتا ہے اور اس پس منظر میں اس کے خاندانی حالات و واقعات تعلیم و تربیت، مذہب، رشتہ دار، دوست احباب اور معاشرہ یہ سب کسی بھی شخصیت کی تکمیل و نشوونما میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ شخصیت سے واقفیت حاصل کرنے میں ان تمام مراحل کا جائزہ لینا ضروری ہے اور شخصیت کو جاننے سمجھنے کے لیے حالات زندگی سے آگاہی نہایت اہم ہے۔ شہزاد احمد صوبہ پنجاب کے ضلع ''امرتسر'' میں ۱۶ اپریل ۱۹۳۲ء کو پیدا ہوئے۔ اس وقت یہ شہر اپنی ایک الگ پہچان رکھتا تھا۔ آپ کا تعلق شیخ برادری سے تھا۔

> ''شہزاد احمد بنیادی طور پر شاعر تھے۔ اپریل ۱۹۳۲ کو امرتسر میں پیدا ہوئے۔ جو اس دور میں لاہور کے ساتھ ایک محلے کی طرح منسلک تھا۔''(۱)

آپ کے والد کا نام حافظ محمد بشیر تھا۔ آپ ماہر طب اور ابتداء میں کانگرس کے رکن بھی۔ برصغیر کے سیاسی صورتحال کا اہم کردار رہے۔ شہزاد احمد کی والدہ کا نام نور جہاں بیگم تھا۔ جب آپ کے والد کا انتقال ہوا تو اس وقت آپ کی عمر چھ برس تھی۔ شہزاد احمد کا بچپن اسی ڈر میں گزرا کہ کہی کوئی ناگہانی حادثہ ہونے والا۔ شہزاد احمد ہمیشہ حادثات دوچار رہے۔ آپ سب سے چھوٹے تھے بہن بھائیوں میں۔ آپ کے بڑے بھائی شیخ محمد یوسف ۱۹۴۶ میں وفات پا گئے۔ ان صدمات نے شہزاد احمد پر گہرے اثرات چھوڑیں۔

شہزاد احمد کی ابتدائی تربیت میں آپ کے بڑے بھائی کا اہم کرادر ہے۔ آپ کو بڑے بھائی کا ساتھ جتنے عرصے میسر آیا اس میں وہ آپ کو ذہنی طور پر وسعت عطا کر گئے اس لیے شہزاد احمد کے شروع کے کلام پر آپ کے بڑے بھائی کی شاعر کے اثرات نظر آتے ہیں۔ آپ نے ابھی باقاعدہ طور پر سکول جانا نہیں شروع کیا تھا۔ اگر دیکھا جائے تو آپ کی ابتدائی تعلیم گھر سے ہی حاصل کی۔ مگر ساتھ ساتھ مکتب سے بھی حاصل کرتے رہے۔ شہزاد احمد د کا بچپن ناساز گار حالات و واقعات سے گزرا۔ آپ کو بچپن میں ہی ایسے حالات واقعات سے گزرنا پڑنا۔ وہ پھر باپ کی موت کو صدمہ ہو یا بڑے بھائی۔

''شہزاد احمد کی طبیعت میں شوخی کا شرارت حس لطافت اور تخلیقی توانائی آپس میں
گھل مل گئی ہیں۔ ''(۲)

دونوں کی وفات کے بعد آپ کا خاندان بدل گیا وہ اس طرح کہ گھر بڑا اور آپ کے وسائل کم اور خاندان میں شہزاد احمد اور ان کی والدہ رہ گئی اور اس وقت حالات بھی خوشگوار نہ تھے گھروں میں محدود رہتے۔

''میرا بچپن بے حد، تنہائی، خوف اور نامعلوم قسم کے حادثے کے انتظار میں گزرا
تھا۔ ''(۳)

پھر آپ کے بھائی کی موت کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ لہذا آپ کا بچپن پیدائش سے لے کر ناساز گار حالات واقعات کے گرد گزرا۔ شہزاد احمد نے ایم۔ اے اوہائی سکول امرتسر میں داخلہ لیا۔ جہاں پر آپ نے ۱۹۳۹ء میں چوتھی جماعت کا وظیفے کا امتحان دیا۔ جس میں مشکل سے ہی آپ ہی آپ پاس ہوئے۔ اسی سکول میں آپ نے ۱۹۴۶ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اسی سال آپ کے بڑے بھائی کا انتقال ہوا۔

شہزاداحمد اوسط درجے کے طالب علم تھے۔ اس کا پتا اس طرح معلوم ہوتا کہ آپ نے چوتھی جماعت کا امتحان مشکل ہی سے پاس کیا۔ اسی کی وجہ دراصل غیر نصابی کتب کا مطالعہ ومشاہدہ تھا۔ آپ سکول کی عمر میں ہی کتابوں کی طرف مائل ہوگئے۔

''شہزاد احمد نے امرتسر میں جس تہذیبی اور ادبی ماحول میں پرورش پائی وہ روایت
کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔ گھروں میں، بیٹھکوں میں، محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔
جہاں شہزاد احمد نے اپنے بڑے بھائی شیخ محمد یوسف کے ساتھ شمولیت اختیار کرتے
تھے۔ نشست وبرخاست کے ادب و آداب ہمیں شہزاد احمد کو میسر آئے۔ ''(۴)

ایک نہایت زیرک مطالعہ کرنے والی شخصیت تھے۔ کتابوں کے مطالعہ کے شوقین تھے۔ آپ نے کم عمری میں وہ کتب پڑھ ڈالی تھی جو کہ نصاب میں لازمی مضمون کے طور پر پڑھائی جاتی تھیں۔

''آپ کو جس کتاب نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ حفیظ جالندھری کی ''سوتے
جاگتے کی کہانی'' تھی پھر ''آب حیات'' بھی پڑھ ڈالی اور داغ دہلوی کی ''مہتاب
داغ'' بھی پڑھ ڈالی اور تیرتھ ران فیروزی کے تراجم اور ناول بھی انہوں نے
اوائل میں پڑھ ڈالے۔ ''(۵)

شہزاد احمد کی خوش قسمتی تھی کہ آپ کو ہمسائیگی بھی عالم فاضل گھرانے کی نصیب ہوئی۔ جہاں حکیم ظہیر الدین صہبائی رہتے۔ حکیم صاحب جو کہ امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ آپ کا تعلیم وتربیت میں ان کا بھی حصہ شامل ہے۔ آپ نے آب حیات پڑھی تو شاعری کی طرف مائل ہونے اور ساتھ ہی غیر نصابی کتب کے مطالعہ کرنے کے سلسلے میں اوسط درجے کے طالب علم کہلائے۔ سکول کے لائبریری کے علاوہ دیگر دوسرے کتب خانوں سے بھی استفادہ کرتے۔ شہزاد احمد گویا ایک نہایت بھلے انسان معلوم ہوتے اورآپ کا تعلیم وتربیت بھی جس علمی وادبی ماحول میں ہوتی اسکا بھی اثر نمایاں نظر آتا۔ ہجرت کرکے شہزاد احمد لاہور آگئے۔ یہ دور معاشی لحاظ سب کچھ خوشگوار نہ تھا۔

وطن میں آ کہ غربت کو تلخیاں نہ مٹیں
مری خبر تو کبھی میرے آشنا لیتے(۶)

جس کے باعث آپ نے تعلیم حاصل کرنا چھوڑ دی۔ مگر پھر آپ ۱۹۴۷ میں ایم اے او کالج لاہور میں گیارھویں جماعت میں داخلہ لیا اور اسی سال فارسی، اکنامکس اور فلسفہ کو بطور اختیاری مضامین اپنایا، ساتھ ساتھ ادبی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔

اس کے بعد ۱۹۴۹ء میں بی۔اے میں داخلہ لیا۔ ۵۰۔۱۹۴۹ء میں آپ کالج سٹوڈنٹس یونین کے صدر بھی رہے۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ ادبی سرگرمیوں میں مصروف عمل رہے۔ شہزاد احمد نے ۱۹۴۹ء میں گجرات میں ایک ''بین الکلیاتی شاعرہ'' ہوا۔ جس میں آپ کوئی انعام تو حاصل نہیں کرسکے مگر آپ کو وہاں سے احمد فراز جیسا دوست فروز ملا۔ اسی مشاعرے میں احمد فراز سے ملاقات ہوئی۔ شہزاد احمد ایک نہایت رحم دل شخصیت کے مالک شاعر اور بچپن سے ہی ایک منفرد انداز کے شاعر تھے۔ شہزاد احمد نے شعر گوئی کی ابتداء سکول کے زمانے میں کی جب وہ چھٹی جماعت میں پڑھتے تھے تو تب انہوں نے پہلی نظم کہی۔ جس کا نام ''ابر'' تھا۔

ابر آ رہے ہیں، ابر جا رہے ہیں
زمانے پر ہر چار سو چھا رہے ہیں
کوئی دم میں مینہ اب برسنے لگے گا
چمکنے کو سورج ترسنے لگے گا
زمین ہو گی تبدیل دلدل کے اندر
سڑک بھیگ جائے گی اک پل کے اندر

چلیں گے زمانے میں جھونکے ہوا کے
سمائیں گے آنکھوں میں منظر بلا کے
سر عام لڑکے نہانے لگیں گے
لڑکپن کی خوشیاں منانے لگیں گے

شہزاد احمد کے بچپن کے دوست اور ہم جماعت مظفر علی سید صدف کے دیباچے میں بیان کرتے ہیں کہ:

"جہاں تک مجھ یاد پڑتا ہے۔ ان کی شعر گوئی ہنستے کھیلتے شروع ہوئی۔ پہلی چیز جو میں نے سنی تھی۔ جس میں سڑکیں، بازار بارش اور اس میں چھینٹے اڑانے والے کھلنڈرے لڑکے ایک مسلسل تصویر کی طرح اب بھی یاد ہیں اس وقت بھی محسوس ہوا تھا کہ وہ اپنے فطری تقاضوں اور محسوسات کو اپنے اصلی رنگ میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔"(۷)

شہزاد احمد ابتداء ہی سے ایک شاعر کی طرز کے انسان تھے جس عمر میں یعنی لڑکپن میں کھیلنے، کودنے اور کسی فکر، لالچ کے بغیر زندگی کو ہنستے ہوئے بسر کرتے ہیں آپ نے وہ سب کتابوں کے مطالعے اور بھائی کے ساتھ ادبی محفلوں میں جاکر اور تلاش و جستجو کے جذبے سے سرشار ہوکر اتنی عمدہ اور پختہ شاعری کیں کہ ناقابل یقین تھا سب کے لیے۔ آپ نے زندگی کے اتار چڑھاؤ کو بھی دیکھا اور اس میں رونما ہونے والے حالات واقعات کو محسوس کیا۔ اس سب کے بعد آپ کی شخصیت اور کلام میں بھی اور پختگی کا احساس بیدار ہو۔ آپ نے سائنسی امور، فلسفہ کو بھی اپنی شاعری میں جس شائستگی و مہارت نے برتا وہ آپ ہی کا وتیرا ہے۔ آپ کو احمد فراز کی رفاقت بھی میسر آئی۔

"شہزاد احمد ایک قابل اعتماد دوست، شفیق شوہر ہے محبت کرنے والا باپ ہے اور خوبصورت شعر تخلیق کرنے والا شاعر ہے۔ اس کے چہرے پر علم اور محبت کی جوت ہے۔ اس کے بات کرنے کا انداز شگفتہ و دلچسپ ہے۔"(۸)

یہ ہی نہیں بلکہ شہزاد احمد کی غیر نصابی سرگرمیاں ان کی نصابی کارکردگی پر اثر انداز ہوئی۔ جس کی وجہ سے آپ بی۔ اے کے لازمی مضمون انگریزی میں فیل ہوگئے۔ جس کے باعث ایم۔ اے میں داخلہ نہ مل سکا۔

۱۹۵۱ء میں شہزاد احمد نے ایم۔ اے نفسیات کی کلاس میں داخلہ لیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں جو کہ اس وقت ادبی لحاظ سے عروج پر تھا۔ آپ کو علم نفسیات سے بھی خاصا شغف تھا اور آپ کو اس میں دلچسپی بھی تھی۔ آپ انسانی

نفسیات کو جانچنے، پڑھنے کی طرف مائل رہے۔ آپ کے ہم عصر طالب علموں میں مظفر علی سید حنیف رامے، ظفر اقبال شامل تھے۔ ایم۔اے نفسیات آپ نے سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا اور اس کی وجہ گھریلو حالات تھے۔

”شہزاد احمد کے پسندیدہ علوم میں نفسیات اور فلسفہ سر فہرست ہیں اور ان شعبہ ہائے علوم کے بنیادی سوال خدا انسان، نفس انسانی اور کائنات کے آغاز وارتقا کے متعلق ہیں۔“(۹)

ایم۔اے نفسیات کرنے کے بعد آپ کے لیے اہم مسئلہ حصول روزگار تھا، جس میں آپ نام بھی رہے۔ مگر جس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت نفسیات کی اتنی اہمیت نہ تھی۔ روزگار میں ناکامی کے بعد آپ نے ایک اور ایم۔اے کرنے کا سوچا۔

۱۹۵۵ میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔اے فلسفہ کی ڈگری حاصل کی۔ ساتھ ساتھ ”راوی“ کے حوالے سے ادبی کاوشوں میں بھی مصروف رہے۔ ۵۴۔۱۹۵۳ تک آپ ”راوی“ کے ایڈیٹر بھی رہے۔ شہزاد احمد کی تعلیم و تربیت میں ان کے خاندان خاص کر بھائی اور والدہ اور دوست احباب اور اساتذہ سب نے نہایت اہم کردار ادا کیا۔

شہزاد احمد نے ان علوم وفنون میں تصنیف و تالیف کے خوب جوہر دکھائے اور آپ نے ان علوم کو شاعری میں بھی آزمایا۔ آپ کی مہارت یہ تھی کہ معلوم ہیں ہوتا کہ آپ کی شاعری ان سے عبارت ہے۔

”شہزاد احمد معاصر اردو ادب کا ایک درخشندہ باب ہے غزل، سائنس، فلسفہ، نفسیات شہزاد احمد کی دلچسپی کے خاص میدان ہیں۔“(۱۰)

ہجرت کے بعد شہزاد احمد اور آپ کی والدہ اکیلے رہ گئے۔ ۱۹۴۶ء میں افراتفری کا دور ہر طرف خوف کا سما تھا۔ ایسے میں ایک گھر دو افراد کی موجودگی ان حالات میں اس حالات اور کیفیت کا انداز ان کے پہلے مجموعے ”صدف“ سے بخوبی لگایا جاسکتا:

لٹ لٹا کر ہی سہی آتو گئے منزل پر
اپنی اس بے سروسامانی پہ کیوں ناز نہ ہو(۱۱)

میری آنکھوں میں ہیں وہ جلتے ہوئے بے تاب دن
خلق سایہ مانگتی تھی اور خدا سنتا نہ تھا(۱۲)

شہزاد احمد کے دوستوں میں صلاح الدین ندیم، مظفر علی سید اور ضیا الدین جیسے لوگ شامل تھے۔ جن کی صحبت نے آپ کو اپنی عمر سے بڑا بنادیا اور ایک دوست سیف الدین سیف جو ہر کہ ہر وقت شہزاد سے فلسفہ سے متعلق بات چیت کرتے تھے یہاں سے آپ کو فلسفہ سے دلچسپی پیدا ہوئی۔

لہذا بر صغیر کے اندر مسلمانوں کی حفاظت، آزادی کی تحریکیں انگریزوں کا تسلط، ہندو مسلم فسادات اور بے روز گاری جیسے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔

ملازمت

حصول علم کے بعد شہزاد احمد کی زندگی کا سب سے اہم مسئلہ روز گار کا تھا۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے ملازمت کا آغاز ۱۹۵۸ء میں کیا۔ آپ سب سے پہلے بحیثیت وزٹینگ لیکچرار ایم۔ اے او کالج میں انگریزی پڑھانے لگ گئے۔ آپ نے پھر چند فلمی گیت بھی تحریر کیے۔ اور ایک فلم ”ساتھ لاکھ“ کے نام سے جس کی ہدایت نگاری کی۔ فلمیں ”سات لاکھ“، ”مہرہ“ اور ”باپ کا گناہ“ کے لیے ڈائیلاگ نگاری بھی کیں۔ پھر حالات کی وجہ سے اکتا گئے اور چھوڑ دیا۔

اس کے بعد با قاعدہ ملازمت کی بنیاد ”تھل اتھارٹی(T.D.A) سے آغاز ہوا۔ آپ نے ۵۸۔ ۱۹۵۹ء ایک سال تھل اتھارٹی میں خدمات سر انجام دی۔ پھر شہزاد احمد ”اسسینٹ ڈائریکٹر پبلک ریلشنز“ کے عہدے پر فائض رہے اور اسی ادارے کے ماہ نامے ”آباد کار“ کے مدیر بھی رہے۔

اس کے بعد شہزاد احمد ”ایگل سائیکل“ بنانے والی کمپنی میں بھی ملازمت کی۔ بھٹو صاحب کے دور میں ”روٹی پلانٹ“ کے جنرل مینجر مقرر ہوئے۔ اس کے بعد پاکستان ٹیلی ویژن پر انہیں سکرپٹ ڈائریکٹر کے طور پر ملازمت کی۔ ۱۹۷۴ء میں اس پہلے شہزاد احمد سنٹرل راولپنڈی Pakistan Council for National Intergration میں بطور سیکشن آفیسر کے تقرر رہوا۔

> ”شہزاد احمد سرکاری نوکریوں کے خلاف تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس سے فن کار کی شخصی و تخلیقی آزادی سلب ہو جاتی ہے اور وہ ایسے ماحول میں کٹھن محسوس کرتے۔“(۱۳)

شہزاد احمد اکثر پیشے بدلتے رہتے جس کی وجہ یہ کہ وہ زندگی کو مختلف زاویوں دیکھنے پرکھنے اور سمجھنے کی کوشش میں لگے نظر آتے اور نئے نئے مفاہیم کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔

ہجرت کے بعد لاہور آئے تو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۹۸۲ء۔ ۱۹۸۶ء تک شہزاد احمد ''ساوتھ لندن'' کے ایگزیکیٹیو رہے۔ Micas associates LTD Karachi میں جنرل مینجر کے طور کام کیا اور پھر ایک ہفتہ وار رسالہ ''معیار'' کے مینجنگ ایڈیٹر اور مارس پرنٹرز کے ایگزیکٹو کے طور پر بھی ملازمت سرانجام دی۔ آپ نے دیگر شعبوں میں دیگر خدمات بطور ملازم کے سرانجام دیں۔ آپ ملازمت کو بدل بدل کر کبھی کہی تو کبھی کہی پر کرتے۔ جس سے آپ زندگی کو نئے نئے انوکھے انداز سے پرکھنے کی کوشش میں سرگرم عمل رہے۔

۱۹۸۴ء میں شہزاد احمد کراچی میں رہائش پذیر تھے۔ شہزاد احمد کو کٹھن مرحلے سے گزرنا پڑا اور یہ مرحلہ تھا زند اور موت کی کشمکش کا شہزاد احمد کا شعری مجموعہ ''ٹوٹا ہوا پل'' اسی تخلیقی صدمے کے بعد بازیافت ہے جو ۲۰۱۰ء میں سنگ میل سے شائع ہوا:

> ''۱۹ مارچ ۱۹۸۴ء کو میں کراچی کی ایک میٹنگ میں مصروف، اسی دوران مجھے دل کا دورہ پڑا اور سانس آنا بند ہو گیا میں نے اپنے ساتھیوں کو اشارے سے بتلایا کہ مجھے دل کا دورہ پڑا ہے۔ ہم جس عمارت میں تھے وہ خاصی اونچائی پر تھی۔ اس کی لفٹ تک جانے میں کافی ٹائم لگتا تھا لہذا میں خود چل کر افٹ تک گیا اور اپنے پیروں پر بلڈنگ سے باہر نکلا۔ محمود شام مجھے لکھے کر کارڈیو ویسکولر انسٹیٹیوٹ میں گئے۔ وہاں بھی میں بھی پیدل کچھ سفر کیا۔ ڈاکٹر سید اسلم کے پاس جب ہم گئے تو انہوں نے دریافت کیا کہ آپ کیا محسوس کر رہے ہیں۔ مجھے اس دوران دل کا دوسرا دورہ پڑ چکا تھا۔ ڈاکٹر نے میری حالت دیکھ کر ویل چیئر پر بٹھا کر ایمرجنسی کی طرف دوڑ لگا دی۔ بستر پر لیٹتے لیٹتے میرے دل کی حرکت بند ہو چکی تھی۔ پہلے مجھے مصنوعی سانس کے ذریعے زندہ کرنے کی کوشش کی پھر سینے پر زور دے کر اور اس کے بعد محمود شام کو باہر بھیج کر مجھے الیکٹرک شال دیے گئے اور خوش قسمتی سے میرے دل نے پھر سے دھڑکنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد میں کوئی ڈھائی ماہ ہسپتال رہا اسی دوران کئی مرتبہ مجھے پر قلبی دمے کا حملہ ہوا، نبض غائب ہوئی۔ کئی دفعہ سی۔ سی۔ یو لے جایا گیا۔ آخر ڈاکٹر نے یہ سمجھو لیا کہ میرا زندہ رہنا ممکن نہیں ہے لہذا مجھے بڑے اہتمام اور انتظام کے ساتھ لاہور بھیجوا دیا گیا۔ میری بھی خواہش لاہور کی مٹی تھی لاہور پہنچتے ہی پھر مجھے قلبی دمہ شروع ہو گیا۔ کو وہ ایک ماہ ہسپتال

میں اسی حالت میں رہا۔ اس کے بعد مجھے ڈاکٹرز نے کہا کہ کوئی پر اگرس نہیں ہو رہی اس لیے تم گھر چلے جاؤ۔ مگر ایک نوجوان ڈاکٹر نے مجھے کہا کہ تم بستر پر پڑے پڑے پریشان ہو جاؤ گے اس لیے تھوڑا تھوڑا چلنا شروع کرو۔ لہذا میں نے باتھ روم تک چلنا شروع کر دیا۔ پھر ایک اور ڈاکٹر کے پاس ویل چیئر پر بیٹھ کر گیا۔ اس نے بھی مجھے چلنے کے لیے راغب کیا اور میری خواہش بھی شدید تھی کہ میں چلوں۔ آہستہ آہستہ میں ڈاکٹر کی ہدایت سے زیادہ چلنا شروع کر دیا۔ دو تین ہفتوں کے بعد جب میں ڈاکٹر کے پاس گیا تو میں پینتالیس منٹ تک واک کر سکتا تھا۔ ڈاکٹر کے لیے یہ بات خوشگوار حیرت کا باعث تھی۔ چیک اپ کے بعد اس نے مجھے واک جاری رکھنے کی ہدات کی۔ آج کل میرے معالج ڈاکٹر افضل نجیب لیفٹینٹ جنرل (ر) مجھ سے زیادہ میری بیماری کے متعلق پریشان رہتے ہیں مگر میں لیبر ٹیز لیتا رہتا ہوں۔"(۱۴)

شہزاد احمد اس صدمے سے گزر کر واپس زندگی کی طرف پلٹے تو ساتھ ہی ایک انتہائی عمدہ و شفاف تخلیق بھی تکمیل کو پہنچی جو کہ کتاب کی صورت میں ادب کے افق پر رونما ہوئی۔ شہزاد احمد کا انتقال یکم اگست ۲۰۱۲ء کو لاہور میں ہوا۔

ختم افسانہ ہوا بات سمجھ میں آئی
ساری دنیا نے مجھے جان لیا میرے بعد(۱۵)

موت اور زندگی کے درمیانی لمحات میں جو واردات پیش آئی جو نہایت شاہکار کے طور پر سامنے کتابی صورت میں آئی۔

"یہ ایک وقت میں شاعری، موت اور زندگی کی کتاب ہے۔"(۱۶)

شہزاد احمد کے اس صدمے کی واردات کا اندازہ ان کے اس شعر سے بخوبی ہو سکتا:

ایک ایسی رات میں نے تیری فرقت میں گزاری ہے
پھر اس کے بعد مجھ موت سے ڈر نہیں آیا(۱۷)

لہذا موت اور زندگی کو اتنے قریب سے دیکھنے، جاننے کے بعد اس کو شاعری میں ڈھالنا ایک بالکل ہی منفرد تخلیقی تجربہ ہے۔ شہزاد احمد جب بیمار تھے تو آپ کے گھر کے مالی حالات اتنے ساز گار نہ تھے۔ روزگار بھی محدود ہو گیا۔

آپ کو شروع شروع میں چلنے سے منع کیا گیا تھا۔ مگر میں نے خود کوشش کی چلنے کی کچھ بہتری ہوتے ہوئے محسوس ہوئی۔ ان حالات میں آپ کے وہ دوست احباب جنہوں نے ان حالات میں آپ کی مدد کی وہ قابل تعریف ہے جن میں اہل قلم حضرات تھے جنہوں نے آپ کی مالی معاونت کی۔ جب شہزاد احمد بیمار تھے تو ان دونوں اشفاق احمد د ان کی خیریت دریافت کرنے گئے تو آپ نے تب ترجمہ کرنے کے لیے شہزاد احمد کو ایک کتاب دی۔ شاید اس سے وہ شہزاد احمد کی مالی مدد کرنا چاہتے ہو اور اس زمانے میں سراج منیر ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور کے ڈائریکٹر تھے۔ انھیں جب علم ہوا کہ شہزاد احمد ایک طویل عرصے سے بیمار ہے تو انہوں نے بھی شہزاد احمد کو ترجمے کے لیے کتابیں بھیجی۔ تو اس طرح بیماری کے عرصے میں شہزاد احمد ادارہ ثقافت اسلامیہ سے منسلک رہے اور اس ادرے میں باقاعدہ تراجم ہوتے رہے اور یہ تراجم کرنا اور کسی کے بعد کی بات نہ تھی۔ اس سب کے لیے شہزاد احمد فائدہ مند ثابت ہوئے۔ وہ اس لیے کہ شہزاد احمد کو اردو اور انگریزی پر قدرت حاصل تھی اور یہ تراجم نفسیات کی کتابوں کے زیادہ تر تھے۔ اس میں بھی آپ کی گرفت مضبوط تھی۔ کیونکہ آپ نے ایم۔ اے نفسیات کر چکے تھے اور ہوتے ہوتے وہ سائنسی علوم سے اپنا رشتہ استواء کرتے وہ سائنسی علوم سے اپنا رشتہ استوار کرتے گئے۔

> ”ان تراجم سے شہزاد احمد کی مالی معاونت بھی ہوئی کیوں کہ وہ ایک خوداری کو ہمیشہ قائم رکھا ان مشکلات انھوں نے اپنے رکھ رکھاؤ اور آن بان میں فرق نہیں آنے دیا۔“(۱۸)

آپ کے دوست احباب اور اہل علم افراد گاہے بگاہے آپ کی کسی نہ کسی طرح مالی معاونت کرتے رہتے تھے۔ خواہ کتب کے تراجم کروانے کی شکل میں ہو یا کسی اور طریقہ سے۔ آپ کیونکہ بیماری کی حالت میں کام نہیں کر سکتے مگر بیٹھے بیٹھے پڑھنے لکھنے پر تو پابندی عائد نہ تھی۔

> ”شہزاد احمد کے متعلق مختصر لفظوں میں یوں کہاں جا سکتا ہے کہ وہ ایک اعلیٰ پائے کا شاعر، ایک اعلیٰ پائے کا مترجم اور صاحب اسلوب سوانح نگار ہے۔“(۱۹)

آپ ادب کے افق پر اپنی پوری آب و تاب ہونے والی شخصیت جس کا نیا انداز آپ کا کمال یہ تھا کہ آپ نے شاعری میں تو طبع آزمائی کی بلکہ ناقابل بیان تخلیقی تجربات سے گزرے اور اس وقت کے اہل قلموں میں خود اپنی پہچان بنائی۔ آپ نے سادہ سے سادہ خیال کو انتہائی مہارت کے ساتھ الفاظ میں بیان کر کے راہ ہموار کی۔ شہزاد احمد نے جس پرکاری سے سائنس اور فلسفے کے گہرے مطالعے نے ان کی شاعری کے اندر بہت سی سمتیں پیدا کر دی جو کہ اردو

شاعری کے لیے نئی بھی اور خوش آئندہ بھی۔ شعر و ادب سے تعلق شہزاد احمد کا اہم زاء ہے پھر وقت کے زینے پر بڑھتے ہوئے مسلسل اردو شاعری کے ایوان میں ان کی آواز کی پرچھائیں طویل سے طویل ہوتی چلی گئی۔

۱۹۵۸ء سب سے پہلے "صدف" شائع ہوئی۔ جس میں ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۷ء تک کی غزلیں شامل ہیں۔ یہ ۱۴ برس سے لے کر ۲۴ برس کے دوران تخلیق کی گئی شاعری ہے اور اس مجموعے کے ذریعے سے ہم شہزاد احمد کے تخلیقی ذہن کی ساخت کو سمجھ سکے۔ صدف کے بعد دوسرا مجموعہ "جلتی بجھتی آنکھیں" منظر عام پر آیا اور اس میں ۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۸ء تک کا کلام شامل ہے۔ یہ ۱۹۶۹ء میں منظر عام پر آئی۔ آپ کو اس پر "آدم جی ایوارڈ" سے بھی نوازا گیا اور یہ غزلیات پر مشتمل ہے۔

"شہزاد احمد کے مزاج میں یہ بات راسخ ہو چکی تھی کہ شعر میں نئے نئے موضوعات اور نئے نئے فنی لوازم کی جستجو کرنی چاہیے۔ جس کی وجہ سے ان کی شاعری کی سب سے نمایاں عصوصیت بھی نئے پن کی تلاش ٹھہرتی ہے۔ اس مجموعے کی شاعری کو پڑھتے ہوئے بھی بار بار یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ شاعر کا تخلیقی عمل سے زیادہ سروکار نئے پن کی آرزو سے ہے۔"(۲۰)

ڈرتا ہوں میرے سر پر ستارے نہ آپڑیں
چلتا ہوں آسماں کی طرف دیکھتا ہوا (۲۱)

ہر پل میں لاکھوں تصویریں ہر لمحہ اک دنیا
کتنے عالم کھو دیتا ہے آنکھ جھپکنے والا(۲۲)

اس کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ اس کے بہت سے اشعار اس دور میں زباں خاص و عام ہو گئے:

میں تیرا کچھ بھی نہیں ہوں مگر اتنا تو بتا
دیکھ کر مجھ کو، تیرے ذہن میں آتا کیا ہے(۲۳)

شہزاد احمد کا تیسرا مجموعہ کلام "ادھ کھلا دریچہ" ہے اس میں غزلوں کے ساتھ نظمیں بھی شامل ہیں۔ اس سے پہلے دو مجموعہ کلام صرف غزلیات پر تھے۔ یہ مجموعہ کلام ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا:

"اس مجموعے کی بیشتر شاعری موضوعاتی و استعاراتی دونوں حوالوں سے اولین عمر
کی صحبت کے تجربے کی عکاس ہے۔"(۲۴)

سیڑھیاں چڑھتے اچانک وہ ملی تھی مجھ کو
اس کی آواز میں موجود تھی اس کی

اس مجموعے کا نمایاں موضوع محبت کی ایک کہانی ہے۔

شہزاد احمد کا چوتھا مجموعہ کلام "خالی آسمان" اس میں غزلیں دونوں شامل ہیں۔ اس کی خاص بات یہ ہے کہ ہر نظم و غزل کے اختتام پر تخلیق تاریخ درج ہے۔ یہ اس دور کا مجموعہ جب مارشل لا لگا اور ذوالفقار علی بھٹو کا دور حکومت تھا۔ البتہ آپ بھی اس وقت کے حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ آپ سیاسی شاعرہ بھی سیاسی شاعری کے زمرے میں جو کہ عرف عام سمجھی جانے والی شاعری سے منفرد ہے۔

زمین اپنے لہو سے آشنا ہونے ہی والی ہے
بہت کچھ ہو چکا اب انتہا ہونے ہی والی ہے

پانچواں مجموعہ "بکھر جانے کی رت" یہ بھی نظموں، غزل پر مشتمل یہ اور اس سے پہلا والا مجموعہ اور یہ پانچوں مجموعے شہزاد احمد کے یک جلدی دیوان "دیوان پہ دستک" میں یکجا کر کے شائع کیے گئے۔ یہ مجموعہ اور اس سے پہلا والا دونوں میں حد تک یکسانیت کے حاصل پائے جائے۔

"ان کے حصہ غزل میں شہزاد کی فنی انفرادیت ہم واری کے ساتھ برقرار رہی اور
ان کا فنی پیراگراف پیراگراف پیچھے نہیں آیا، دوسرے یہ کہ نظموں میں قومی،
دینی اور ملی حوالے نمایاں ہو گئے۔"(۲۵)

اس دوران آپ کا کشمیر کے تاریخی تناظر پر مشتمل ڈراما "وفا" پاکستان ٹیلی ویژن پر دکھایا گیا اور اس جہنم کا ذکر کیا جو آج جنت کشمیر پر بھڑک رہا۔

جس طرف سے ہمیں آتی ہے جہنم کی ہوا
اس طرف جنت کشمیر بھی ہو سکتی ہے(۲۷)

یہ شہزاد احمد کے اس دور کی شاعری پر مشتمل ہے جو انہوں نے ۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۴ء کے دوران کی۔

"یہ دور ہماری قومی زندگی اور خود شہزاد احمد کی ذاتی زندگی دونوں حوالوں سے بے حد اہم ہے۔"(۲۷)

شہزاد احمد کا ساتواں مجموعہ "کون اسے جاتا دیکھے" غزلوں، نظموں اور شعری تراجم کا حامل ہے۔ مگر غزل کے شعر کی یہ خوبی ہے کہ وہ الگ سے ایک مکمل اکائی ہوتا ہے۔ آپ کے اس مجموعے میں بوسنیا اور کشمیر میں ہونے والے مظالم کے واضح آواز ملتی ہے۔

شہزاد احمد کا آٹھواں مجموعہ "پیشانی میں سورج" ان کے دیگر کلام سے منفرد خدا کے بارے میں ان کے نظریات شروع ہی سے تشکیک کے حامل تھے۔ یہ تشکیک زندگی کے نظام کے حوالے سے گزرتی ان کے اس مجموعے تک آ پہنچی اور یہاں تک آتے نکتہ نظر بھی تبدیل ہو گیا۔

"اس مجموعے میں ان طرز احساس اور طرز کلام دونوں ہی تبدیل ہوئے۔"(۲۸)

اس کا اظہار حمد یا نعت کی صورت میں کیا جاتا ہے۔ مگر آپ کے ہاں حمد یا نعت پہلے نہیں بلکہ تسلسل شاعری میں رکھا۔

"ایسا لگتا ہے کہ زندگی کے طویل سفر کے بعد شہزاد احمد نے اس کائناتی آہنگ کو جان لیا۔ جو کائنات کے ذرے ذرے میں جاری و ساری ہے۔ اس منزل تک آنے کے لیے وہ فلسفہ کی تشکیک، نفسیات کی بھول بھلیاں، سائنس کا عدم تعین تمام راہوں سے گزرے۔ اس کے پس منظر میں ان کی عارضی موت کا تجربہ بھی شامل محسوس ہوتا ہے اور اس تجربے سے گزر کر واپس زندگی تک آنے کے لیے جس یقین کی ضرورت ہوتی، اس نے انھیں تشکیک کی راہوں سے کھینچ کر یقین کے کے راستے پر ڈال دیا۔ اس مجموعے کی شاعری کا اہم رویہ یہی آہنگ ہے جو مسلسل اپنا احساس دلاتا رہتا ہے۔"(۲۹)

نواں مجموعہ کلام آپ کا غزلیہ شاعری پر مشتمل ہے۔ جو پنجابی شاعری پر مشتمل ہے جو پنجابی شاعری پر مشتمل ہے۔ "جاگن والی رات" کے نام سے۔ دسواں مجموعہ آپ کا "اترے میری خاک پر ستارہ" اور گیارھواں "معلوم سے آگے" نظموں پر مشتمل ہیں۔ اگرچہ بارھواں مجموعہ کلام "اندھیرا دیکھ سکتا ہے" کے نام سے ہے۔ یہ بیش تر نظموں کا حامل ہے۔ یہ وہ مجموعیہ جس میں سب سے کم غزلیں غزلوں کی تعداد کم ہونے کے باوجود ایسے اشعار ملتے جس سے معلوم ہوتا کہ یہ شہزاد احمد کے اسلوب شعر کے نمائندہ اشعار ہیں۔ جو شعری تجربے اور زندگی کی آرزوں سے تخلیق

ہوئے۔ ”ایک چراغ اور بھی“ شہزاد احمد کا تیرھواں مجموعہ ہے۔ یہ غزلوں کا مجموعہ زیادہ ہے اور اس میں صرف چند نظمیں۔

”اس میں محبت اور مابعد الطبعیات کے ساتھ ساتھ سائنس کے بھی رنگارنگ موضوعات کی فراوانی ہے انہوں نے بہت سے چراغوں کی موجودگی میں اپنا ایک الگ چراغ روش کیا۔ جو پہلی ہی نظر میں پہچانا جاتا ہے۔ اس کتاب میں معنی کی تہیں کچھ اور فراواں وہو گئی ہیں۔“(۳۰)

شہزاد احمد کا چودھواں کلام ”آنے والا کل“ ان کے دور بزرگی کا نامہ ہے۔ شہزاد احمد کی شاعری کی عمر گویا پاکستان کی عمر سے ایک سال زیادہ کی ہے۔ سائنسی موضوعات سے ابتدا سے ہی شغف تھا جس کا اظہار ان کے مجموعوں میں بھی ملتا ہے۔ مگر آنے والا کل تک پہنچتے پہنچتے ان کا سائنسی شعور تخلیقیت میں رش پس گیا کہ سائنس اور شاعری اس مجموعہ میں آکر یکجا ہو گئے۔

”مٹی جیسے لوگ“ آپ کا پنجابی مجموعہ ہے۔ پندرھواں اور یہ اس لیے بھی منفرد کہ اس میں باقیوں کی نسبت غزل اور نظم کا تناسب برابر۔ اس سب کے علاوہ شہزاد احمد نے تراجم میں بھی طبع آزمائی کی۔ نثر میں تو آپ نے اعلیٰ پائے کی اپنے الگ اسلوب بیان کی نثر تخلیق کی آپ کی نثری کتب درجہ ذیل ہے:

۱۔ مذہب تہذیب اور موت

۲۔ ذہن انسانی کا حیاتیاتی پس منظر

۳۔ سائنسی انقلاب

۴۔ ژونگ کی نفسیات اور مخفی علوم

۵۔ دوسرا رخ“ شامل ہیں۔

تراجم

تخلیقی رویے ۱۹۸۶ء ارمان اور حقیقت سائنس کے عظیم مضامین۔

اعزازات

۱۔ انجمن ترقی اردو کا بہترین مضمون نویس ایوارڈ

۲۔ آدمی جی پرائز، شاعری ۱۹۴۹ء

۳۔ علامہ اقبال پرائز شاعری ۱۹۹۶ء

۴۔ علامہ اقبال پرائز شاعری ۱۹۹۶ء

۵۔ مسعود کھدر پوش ایوارڈ پنجابی شاعری ۱۹۹۷ء

۶۔ صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی (شاعری) ۱۹۹۷ء

سیاحت

امریکہ، برطانیہ، کینڈا، ناروے، چین، ملائشیا، سنگاپور، فرانس اور تھائی لینڈ

حوالہ جات

۱. اسد عباس عابد، غزل گو شہزاد احمد، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۸ء، ص ۱۳

۲. ضیاء الحسن، ڈاکٹر، شہزاد احمد شخصیت و فن، ۲۰۱۲ء، ص ۲۲۰

۳. گلزار جاوید، انٹرویو، ''براہ راست''مشمولہ، ''چہارم سو''، جنوری، فروری، ۲۰۰۹ء، راولپنڈی، ماہ نامہ، جلد ۱۸، ص

۴. اسد عباس عابد، غزل گو شہزاد احمد، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۸ء، ص ۲۲۲

۵. ایضاً، ص ۱۸

۶. شہزاد احمد، دیوار پہ دستک، مجموعہ، صدف، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ص ۲۰۱۸ء، ص ۲۰۹

۷. ایضاً، ص ۶

۸. گلزار جاوید، انٹرویو، ''براہ راست''مشمولہ، ''چہارم سو''، جنوری، فروری، ۲۰۰۹ء، راولپنڈی، ماہ نامہ، جلد ۱۸

۹. اسد عباس عابد، غزل گو شہزاد احمد، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۸ء، ص ۲۲۰

۱۰.

۱۱. شہزاد احمد، دیوار پہ دستک، مجموعہ، ''صدف''لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء، ص ۱۲۱

۱۲. ایضاً، ص ۱۴۹

۱۳. اسد عباس عابد، غزل گو شہزاد احمد، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۸ء، ص ۳۰

۱۴. گلزار جاوید، انٹرویو، ''براہ راست''مشمولہ، ''چہارم سو''، جنوری، فروری، ۲۰۰۹ء، راولپنڈی، ماہ نامہ، جلد ۱۸، ص ۱۱

۱۵. شہزاد احمد، دیوار پہ دستک، مجموعہ، ''صدف''لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء، ص ۳۳۱

۱۶.

۱۷. شہزاد احمد، ٹوٹا ہوا پل، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء، ص ۱۲۷

۱۸. اسد عباس عابد، غزل گو شہزاد احمد، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۸ء، ص ۳۴

۱۹. اسد عباس عابد، (مرتبہ) شہزاد احمد کے شعری افکار، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۸ء، ص ۵۰

۲۰. ضیا الحسن، ڈاکٹر، شہزاد احمد شخصیت و فن، ص ۵۰

۲۱. شہزاد احمد، ٹوٹا ہوا پل، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء، ص ۲۸۰

۲۲. ایضاً، ص ۳۱۶

۲۳. ایضاً، ص۴۰۶

۲۴. ضیاالحسن،ڈاکٹر، شہزاد احمد شخصیت و فن، ص۵۶

۲۵. اسد عباس عابد،(مرتبہ) شہزاد احمد کے شعری افکار، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۷ء، ص ۱۲۲

۲۶. شہزاد احمد، دیوار پہ دستک، مجموعہ، بکھرنے جانے کی رت، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء، ص ۸۶۴

۲۷. ضیاالحسن،ڈاکٹر، شہزاد احمد شخصیت و فن، ص۶۷

۲۸. ایضاً، ص۳۷

۲۹. ایضاً

باب دوم

نظم تعریف وروایت

باب دوم

نظم تعریف وروایت

نظم کی تعریف

لہٰذا اردو ادب کی دو اصناف ہے۔ ایک نثر تو دوسری نظم یعنی اردو شاعری۔ نظم شاعری کی ایک ایسی قسم ہے جو کہ کسی ایک عنوان پر لکھی جاتی ہے۔ نظم زندگی کے کسی بھی موضوع پر لکھی جاسکتی ہے۔ نظم شاعری کی ایک شکل ہے۔ جس میں کوئی قصہ، تجربہ اور خیال کو تسلسل کے ساتھ لفظی تصویر کشی کی جاتی ہے۔ کیونکہ اس کے معنی ہی یکجا اور پرونے کے ہے۔

نظم اطالوی زبان کا لفظ ہے۔ جس کو انگریزی میں (Poem) کہا جاتا ہے اور اطالوی زبان میں اس کے معنی "Making"، "Creating" کے ہیں۔

> "تسلسل پر مبنی اشعار کا ایسا مجموعہ جس میں مرکزی خیال موجود ہو نظم کہلاتا ہے۔"(۱)

نظم کے معنی پرونا کے ہے اور کسی بھی خیال کو تواثر کے ساتھ بیان کرنا۔

> "نظم شاعری کی وہ شکل ہے جس میں کوئی واقعہ تجربہ یا کوئی خیال تسلسل کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے کیونکہ نظم کے معنی ہی پرونے اور یکجا کرنے کے ہے۔"(۲)

نظم کے لیے موضوع کی کوئی قید نہیں۔ اس میں موضوع سخن کوئی بھی ہو سکتا۔ موضوع کی کوئی پابندی نہیں۔ ہاں البتہ وہ نظم کے اصول و قواعد کی پابندی لازم ہے اور اس میں یہ بھی ضروری کہ خیال یا معنی دونوں لحاظ سے اس میں تسلسل ہو اور ایسا ہو کہ ایک شعر دوسرے شعر سے پیوست ہوتا چلا جائے۔ وزیر آغا نظم کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ

> "نظم کے پیکر کی خصوصیت اس کی اکائی ہوتی ہے اور نظم کا ہر مصرعہ اپنی مجرد حیثیت سے محروم محض ایک مرکزی خیال کی تعمیر میں صرف ہوتا ہے۔"(۳)

نظم میں کسی بھی تصور، خیال اور چاہے وہ زندگی کے کسی بھی شعبہ ہائے حیات سے ہو تو بیان کیا جاسکتا ہے۔ اس میں ہیت کی بھی قید نہیں۔ نظم کی کوئی مقررہ شکل یا مقررہ ہیت نہیں ہوتی۔

نظم کا سب سے بنیادی وصف تسلسل خیال ہے۔ جس کے ارد گرد پوری نظم گھومتی ہے۔ اس میں شعروں کی بھی کوئی خاص تعداد متعین نہیں۔ اس کی بنیادی اور واحد اہمیت کی حامل ایک ہی چیز ہے وہ ہے تسلسل و روانی۔ کسی ایک بنیادی موضوع کے تحت اس کو بیان کیا جاتا ہے۔ اس کا ایک مرکزی خیال ہوتا ہے اور پھر اسی کے گرد پوری نظم کا تانا بانا ملتا جلتا ہے۔ یہ بحر اور قافیہ سے پابند اور ان سے آزاد بھی ہوتی ہے۔ نظم میں موضوع خامے وسعت کے حامل ہے۔

"نظم بحیثیت مجموعی شخصی تاثرات کی نقاب کشائی ہے"(۴)

نظم میں ایک ہی خیال تسلسل خیالات ہے۔ یہ بنیادی طور پر کا وسیلہ ہے۔ نظم کا لفظ عام طور پر نثر کے مقابلے میں استعمال کیا جاتا ہے اور اسی اعتبار سے قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، غزل اور رباعی اور دیگر اصناف شاعری کے ہی زمرے میں آتے ہیں۔ نظم میں گویا ہیئت مخصوص نہیں۔ ہاں مگر اس میں اس کے اشعار میں خیال کا تسلسل پایا جانا ضروری ہے۔ لہٰذا نظم کسی ایک موضوع پر کہی جاتی ہے۔

"نظم میں شاعر اپنے عہد کے کسی مخصوص طبقاتی یا ثقافتی گروہ سے بھی مخاطب ہو سکتا ہے اور عام لوگوں سے بھی۔"(۵)

نظم زندگی کے کسی بھی خواہ وہ کسی بھی واقعے یا خود انسان سے منسلک موضوعات ہو ان سب کو بیان ایک تسلسل کے ساتھ نظم کی صنف میں بیان کیا جاتا ہے اور نظم شاعری کی ہے ہی ایسی صنف کہ اس میں زندگی کے کسی بھی موضوع کو موضوع سخن بنایا جاتا۔ نظم کو کلام موزوں کہا جاتا ہے۔ یعنی اس میں استعمال ہونے والے الفاظ و محاورات یا تراکیب و اصطلاحات موزوں طریقے سے کسی خاص سانچے یا آہنگ میں ڈھلے ڈھلائے ہوتے۔

یہ اشعار کا ایسا مجموعہ ہے جس میں کوئی بھی موضوع ایک ربط کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

"نظم ایک مکمل تخیلی یا شاعرانہ تجربے کے فن کارانہ اظہار کا نام ہے۔"(۶)

نظم میں موضوع کی کوئی پابندی نہیں۔ اس میں عشق، تصوف، فلسفہ، مذہب، سیاست اور معاشرت وغیرہ وغیرہ غرض تخلیقی خیال کی روانی کے ساتھ بیان کرنے کا نام نظم ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نظم نے نئ فنی و فکری لحاظ سے ترقی کی اور ترقی کی منازل طے کرتے کرتے الگ صنف کے طور پر مروج ہوئی۔

"نظم کا لفظ جب شاعری کو ایک مخصوص صنف کے لیے استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے وہ نظمیں مقصود ہوتی ہیں جن کا کوئی حسین موضوع ہو اور جن فلسفیانہ، بیانیہ،

یا مفکرانہ انداز میں شاعر نے کچھ خارجی اور کچھ داخلی دونوں قسموں کے تاثرات پیش کیے ہوں۔"(۷)

گویا نظم کا لفظ ہی شاعری کی خاص ان معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ان میں کہ اشعار کا ایسا مجموعہ ہے جن میں ایک مرکزی خیال ہو پوری نظم اس مرکز کے گرد گھومتی ہے۔ اس میں انسان اور انسان سے جڑے موضوعات کا بیان ہے کیونکہ اس میں انسان اور اس سے جڑے اور داخلی و خارجی واقعات و حالات پیش آنے والے تمام تجربات کا بیان ایک لڑی میں پرونے کا نام نظم ہے۔ اس کے معنی ہے پرونے کے یعنی ایک لڑے میں تمام موتیوں کو پرونا کے ہے۔ ایک مرکز کے تحت بکھرے موتیوں کو ایک لڑی میں پرونا ہے۔ لہٰذا اس کا اطلاق مختلف سلسلوں میں مختلف معنوں میں استعمال ہوتا رہا ہے۔ کبھی غزل کو الگ کر کے تو دیگر اصناف کے لیے استعمال کیا گیا۔ مگر جب یہ لفظ شاعری کی ایک مخصوص صنف کے لیے ہو تو اس کا مطلب اشعار کا ایک ایسا مجموعہ جس میں ایک مرکزی خیال ہو۔ البتہ اس میں ایک ہی مرکز و وحدت تصور ہوتا ہے۔ جس کے دائرے میں پوری نظم کا بیان بلکہ موضوع کا بیان نظم کی صورت میں بیان کیا جاتا ہے۔

"چنانچہ نظم لمسی، بصری، شمعی، سامی اور لذتی (Taste) حواس کی تشفی کا سامان کرتی ہے۔"(۸)

نظم مختلف النوع انسانی جذبات و احساسات کی نظم کے سانچے میں مرقع نگاری کرتی ہے۔ لہٰذا نظم کی ایک جامع تعریف ایسی جو تمام جہات پر حاوی ہو ممکن نہیں۔ ابھی تک نہیں ہو سکی۔ اسی لیے اس کا تعین وسعت کا حامل ہے۔ ہر شعری تخلیقی ذہن نے اس نئے نئے زاویے سے اپنے تجربات میں بیان کیا ہے۔

اردو میں یہ لفظ فارسی سے لیا گیا ہے۔ فارسی شعر و ادب میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا۔ ایک کلام موزوں یا نظم کرنے کے معنوں میں دوسرے نثر کے مقابل میں شعر کے معنوں میں۔ گویا تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے شاہ میراں جی شمس العشاق نے لفظ نظم کا استعمال کیا۔ دکنی دور سے ہی / ہی سے غزل کو چھوڑ کر دوسری اصناف سخن مثلاً مثنوی، قصیدہ، رباعی کو نظم سے جوڑنے کا رجحان کم ہو گیا اور نظم ایک الگ صنف کے طور پر جانی جانے لگی۔ اسی لیے کہا گیا کہ ہر شاعرانہ تخلیق خواہ وہ کسی صنف میں ہو، نظم کہلا سکتی تھی۔

نظم میں موضوع کی قید و بند نہیں۔ اس صنف میں موضوع کافی وسیع ہے۔ یہ صنف سخن وسعت کی حامل ہے۔ کوئی بھی خیال ایک ہی وحدت میں تسلسل کے ساتھ بیان کرنا فن کارانہ زاویے سے۔

نظم کا ہر شعر ایک اکائی ہوتا ہے۔ اس کسی بھی جذبے کو فن کارانہ انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔ اگر کسی بھی خیال کو تخلیقی تجربے سے گزار کر فن کارانہ انداز سے اور وحدت سلسل کے ساتھ بیان کیا جاتا تو نظم بھی ایک اکائی کی مانند ہے۔

"چنانچہ ہر اس شعری تخلیق کو نظم کا نام دیا جانے لگا جو موضوع کی وحدت اور ربط وارتقا کی آئینہ دار ہو۔"(۹)

ہر عہد میں دیگر اصناف کی طرح ہر تخلیقی ذہن میں جو خیال رونما ہوتا ہے ان کا فن کارانہ زاویے سے بیان نظم کے زمرے میں آتا ہے۔ نظم میں موضوع سخن کی کوئی پابندی نہیں۔ اور اشعار موضوع و خیال میں ایک دوسرے سے اس طرح پیوست ہوتے ہیں کہ بعد میں نظم بھی ایک اکائی معلوم ہوتی۔ اس کی ایک اور منفرد خاصیت کے نظم کسی بھی عنوان کے تحت لکھی جاتی ہے۔

شعرا حضرات انسانی مسائل کو اپنے زاویے سے دیکھتے ہوئے لفظوں پیر ہن میں ڈھالتے ہیں۔ یہ شخصیت کا ہی والہانہ انداز ہے۔ اس میں تسلسل وحدتِ مرکز ہونے کے ساتھ ترنم کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔ جو کہ اس کی تاثیر کو بڑھانے میں معاون ہوتا ہے۔ نہ ہی اس میں طوالت کی کوئی پابندی نہیں اور یہاں تک کہ اس میں زماں و مکاں کا ہر موضوع سما سکتا ہے۔ خواہ وہ محبت کا ہو، غم کا ہو، انتہائی سادہ زبان اور نازک انداز میں بیان کیا جاتا۔ محبت ہی کو نہیں تمام شعبہ ہائے حیات سے منسلک اور انسانی جذبات و احساسات اور خیالات کو، زندگی کی چمک دمک، موت کا درد البتہ ہر موضوع کے لیے نظم ایک بہترین ذریعہ اظہار ہے۔

"موجودہ تصور کے اعتبار سے نظم ایک مکمل تخلیقی یا شاعرانہ تجربے کے فن کارانہ اظہار کا نام ہے"(۱۰)

نظم میں موضوع کے معنی و مفہوم کو مد نظر رکھ کر طویل بات چیت کی جاتی ہے۔ اور ایک خیال ہی ایک مکمل نظم کا مواد ہوتا ہے اور شاعر اسے اپنی فن کارانہ صلاحیتوں سے الفاظ کا جامہ پہنا کر روانی کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ تسلسل ہی اس کی سب سے بڑی خاصیت ہے۔ خواہ وہ جس بھی موضوع پر لکھی جائے اس کا موضوع کوئی بھی ہو سکتا۔ ہر شاعر اس کو اپنے نقطہ نگاہ سے بیان کرتا ہے۔ نظم میں کوئی موضوعاتی قید و بند نہیں۔

تجربات سے ہی زندگی کے امکانات نظر آتے ہیں اور انہی امکانات سے زندگی کو آگے بڑھانے رواں دواں رکھنے کا احساس ہوتا اور اسی احساس کو کسی خاص انداز سے لفظوں میں ڈھلنے کے بعد لڑی میں پرونے کا بہترین ذریعہ نظم ہے۔ اس میں سب سے بڑی اکائی خیال کی ہے۔

"خیال خواہ کسی نوعیت کا ہے۔ کسی بھی شعبہ حیات سے تعلق رکھتا ہو۔ اگر وہ جذبے کی تیز آنچ میں پگھل کر تپ کر نکھرتا ہے اور کندن کی طرح دمکنے لگتا ہے تو شعری خیال بن جاتا ہے۔ نظم کا تعلق اسی شعری خیال سے ہے۔ یہ عقلی نہیں بلکہ جذباتی واحساساتی آہنگ رکھتا ہے۔"(۱۱)

نظم فرد کی انفرادیت کی بھرپور غماز ہے۔ نظم ایک بہترین ذریعہ ہے انسانی جذبات کا۔ اس میں بنا کسی ٹوٹ پھوٹ کے اور احساسات کو منتشر الفاظ میں بیان کرنے کی بجائے تسلسل کے ساتھ سادہ زبان میں بیان کیا جا سکتا ہے اور پڑھنے والے کو احساس بھی نہیں ہوتا کہ یہ کسی اور کے جذبات واحساسات ہیں۔ بلکہ اس کے اپنے پڑھنے والے کے ہو جیسے نظم میں وحدت جہاں محض ایک ہی خیال کا ارتقا ہوتا ہے۔ نظم فرد کی مکمل شخصیت کی پیداوار ہے۔ بالکل جیسے الفاظ اور خیالات کو عنوان کے تحت کسی مقصد کے لیے اور پیغام کے ساتھ لڑی میں پرونا نظم کہلاتا ہے۔ لہٰذا جب لفظ نظم استعمال میں آتا تو اس سے خاص صنف مراد لی جاتی ہے اور اس صنف کی شناخت کا مسئلہ پیچیدگی کا حامل ہے۔ وہ اس طرح کہ اس کی پہچان نہ موضوع سے ممکن ہے نہ ہیئت سے۔ یہ صنف ہی ایسی کہ جس پہچان ذرا۔

یہ صنف ایک ہمہ گیر اور وسیع تر صنف ہے جو کہ مختلف ہیئتوں میں لکھی جاتی ہے اور جہاں بھر کے موضوعات اس کی بساط میں سمٹتے رہتے ہیں۔ اس میں موضوع کو بھی خیال ہو سکتا ہے۔ خیال اور پھر اس خیال کو الفاظ کے لبادے میں تسلسل کے ساتھ پیش کر اس صنف میں بیان کرنا۔ اسی صنف میں ممکن اور یہی اس کی سب سے بنیادی اکائی وخوبی ہے۔

نظم میں خیال کسی اور جذبہ کو اہمیت حاصل ہے۔ جذبہ کوئی بھی ہو سکتا، حب الوطنی، پیار و محبت کا، قومی، معاشرتی اور انسانیت کا ان سب کا بیان ایک تسلسل کے ساتھ بنا کسی ٹوٹ پھوٹ کے اور انتہائی جاذب طریقے سے نظم میں ہی سمٹ سکتا ہے۔

نظم ادب کی ایک ایسی صنف ہے کہ اس میں ہر ایک نے طبع آزمائی نہیں کی۔ یہ خاص لوگوں کے لیے خاص صنف کے طور پر ہی جانی پہچانی جانے لگی اور اس میں لکھنے والوں نے بے شمار شاہکار چھوڑے۔

نظم کی روایت

جدید شاعری میں اردو نظم انیسویں صدی کے نصف آخر سے اس کا آغاز ہوتا ہے اور اس کو پروان چڑھانے والوں میں پہلا اہم نام مولانا محمد حسین آزاد کا ہے۔ جنہوں نے شاعری کی فرسودہ روایت کو زمانے کے نئے تقاضوں سے

ہمکنار کرنے کے لیے جدید شاعری کو تحریک دی اور اس کے لیے آلہ کار یعنی انجمن پنجاب اور دیگر جلسوں میں جدید شاعری میں ہونے والے واقعات و رویے کی حمایت کی۔

"نظم نگاری ایک علیحدہ صنف سخن کی حیثیت سے ۱۸۵۷ء میں انجمن پنجاب کے مشاعرے سے وجود میں آئی۔"(۱۲)

آزادؔ نے روایتی انداز کی شاعری سے ہٹ کر جدید شاعری کی راہیں ہموار کیں اور اس میں نت نئے موضوعات کو بھی وسعت دی۔ آزادؔ قدیم روایت سے ہٹ کر جدید کی طرف خود بھی مائل ہوئے اور دوسرے آنے والوں اور اپنے ہم عصروں کے لیے بھی نیا زاویہ فکر دیا۔

۱۸۷۴ء میں باقاعدہ اس کا آغاز ہوا اور ۱۸۶۷ء میں انجمن پنجاب کے زیر اہتمام منعقد کیے گئے جلسے میں آپ نے قدیم شاعری کی فرسودگی اور جدید شاعری کی طرف سب کی توجہ مبذول کروائی۔ یہی نہیں آپ نے باقاعدہ مشاعرے میں نظمیں بھی پڑھیں اور انیسویں صدی کے وسط سے شاعری کے معیارات کے نئے نئے نمونے اردو میں شامل ہوتے گئے تو شعر گوئی کے لیے نت نئے موضوعات متعارف ہوئے۔

نظم کی قدیم اصطلاح کسی حد تک متعین کردہ معنی و مفاہیم میں رائج ہونے لگی اور پھر نظم کا تصور ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد پیدا ہوا۔ انگریزوں کی ہندوستان میں آمد کا دور دورہ تھا۔ یہ ایک طرح سے اردو شاعری کے لیے نشاۃ ثانیہ کا بھی آغاز تھا۔ یورپی علوم وفنون، تہذیب و تمدن، فکر و فلسفہ، سائنس اور دوسرے شعبہ ہائے فکر و خیال ہندوستانی ذہنوں پر اثر انداز ہونے لگے اور ساتھ ہی اس میں مغربی تعلیم یا نظام تعلیم کا بڑا عمل دخل تھا۔ جس کی بنیاد اصولوں کی بجائے عقلیت پر تھی اور جس کے زیر سایہ تمام شعبوں میں نیا انقلاب رونما ہونے لگا۔ سب کے ساتھ ساتھ شاعری بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی اور یورپی تہذیب کے زیر اثر نظم میں نت نئے موضوعات پنپنے لگے۔

اور سب سے پہلے آزادؔ، حالیؔ کے حالات سے متاثر ہوئے اور ساتھ ہی انگریزی شاعری سے واقفیت بھی بڑھتی گئی اور نظم کی اصطلاح غیر شعوری طور پر نئی تخلیقات کے لیے استعمال ہونے لگی۔

"مغربی ادبیات سے نظم کو فروغ ملا۔ جبکہ شاعری میں نظم کی جانب شعراء کا میلان گویا زندگی سے شدید وابستگی اور تجزیے کے عمل کی صورت ابھری تھی۔ اپنی ہیئت کو ذرا سا بدل کر نظم کے پیکر میں ڈھال گئی۔ شاعر نے بھی نظم کو اپنے تجربات و واردات کے مطالعہ کے لیے وقف کر دیا۔ چنانچہ نظم میں جو ایک خاص

فرد کے دل کی دھڑکن سنائی دیتی۔ نظم بحیثیت مجموعی شخصی تاثرات کی نقاب
کشائی کرتی ہے۔ نظم فرد کی بھرپور انفرادیت کی غماز ہے۔"(۱۳)

دراصل حالیؔ اور آزادؔ قدیم دور کی شاعری کے فرضی خیالوں سے بے زار سے ہونے لگے۔ اتنے میں آپ دونوں نے انگریزی ادب کی نظموں کو دیکھ کر اردو میں ایسی شاعری کا رواج چاہتے تھے جو موضوع صداقت شعاری کے ذہن میں شاعری کا نیا تصور "مثنوی" کی صنف میں سمویا۔

اس دور نظم کی اصطلاح مثنوی کے علاوہ دیگر صنف مرثیہ قصیدہ کے لیے بھی استعمال ہونے لگی۔ اس دور میں نظم کے موضوع کے ربط و تسلسل کے مفہوم کی اہمیت مسلم ہوگئی اور یہ پہلا قدم تھا جو تحریک کی صورت اٹھایا جبکہ آزادؔ نے کرنل ہالرائیڈ ڈاریکٹر تعلیم پنجاب کے کہنے پر "انجمن پنجاب" کی داغ بیل ڈالی اور اس میں غزلوں کے علاوہ مخصوص موضوعات پر نظمیں بھی پڑھی جاتیں۔

محمد حسین آزادؔ نے ایک لیکچر میں جو نظم کے تصور کی حد تک ایک افتتاحی لیکچر سمجھا جاتا۔ نئ نظم کے موضوعاتی تبدیلی کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور اس تصور کے پیش کرنے کے لیے نظمیں لکھیں اور دوسرے شعراء سے بھی نظمیں لکھنے، کہنے کو کہتے۔ حالیؔ نے بھی محمد حسین آزادؔ کی ہمنوائی کی۔

"اردو شاعری میں نظم کی روایت زمانہ قدیم میں بھی موجود تھی۔ تاریخی اعتبار
سے دیکھا جائے تو اردو نظم کی بہت سی مثالیں مختلف اصنافِ سخن میں بکھری ہوئی
نظر آجاتی ہیں۔"(۱۴)

محمد حسین آزادؔ نظم کی ترویج اور شاعری کو گنے چُنے سے نجات دلانے کا ذمہ اپنے سر لیا اور نظم کو نئے موضوعات سے روشناس کیا اور پہلے پہل موضوعی نظمیں لکھیں جاتی تھی۔

سلطان قلی قطب شاہ کی کلیات میں ہندوستان کے میلوں، تہواروں اور تقاریب پر مبنی موضوعاتی نظمیں ملتی ہے۔ یہ صنف پہلے پہل مختلف صورتوں میں سفر کرتی نظر آتی ہے۔ اوائل میں مثنوی کے رویے میں تو۔ جس کا آغاز دکن سے ہوا اور دوسری صورت اس کی قصیدہ کی شکل ہے۔ اس صنف کو انشاؔ، ذوقؔ سے عروج بخشا۔ پھر یہ تیسری صورت شہر آشوب میں بھی سامنے آئی۔ اس کا میدان قصیدے، مثنوی جتنا وسیع نہیں تھا۔ جبکہ موجودہ دور میں یہ صنف الگ صنف کے طور پر فروغ پاچکی اور اپنی انفرادی حیثیت منواچکی اور اب جذبات، تجربات اور احساسات کی ترجمان بنی۔

"شعری تجربہ جب شاعر کی داخلی شخصیت کے آتش خانوں میں تپ کر نکھرتا ہے
اور پھر ایک پُراسرار تخلیقی عمل کے تحت موزوں، حسین اور مترنم الفاظ کے
قالب میں اس انداز سے ڈھل جاتا ہے کہ قاری کے دل و دماغ متاثر ہوئے بغیر نہ
رہے تو ایک نظم معرض وجود میں آتی ہے۔"(۱۵)

اس میں داخلی و خارجی تجربات کی روداد ہے۔ لہٰذا ہر شعری تجربہ نت نئے ہیئت اور نت نئی صنف میں تخلیق ہوتا رہتا ہے اور اظہار کے نئے نئے سانچے تخلیقی مراحل سے دوچار ہوتے رہتے ہیں۔

جدید دور میں نظم کو ایک الگ و منفرد صنف کی حیثیت سے فروغ ملتا رہا اور ایسا لگتا کہ جیسے نظم ہی وہ صنف جو کہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی بدولت اردو شاعری کو اس قابل بنائے گی کہ وہ دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زباں کی شاعری کے ساتھ آنکھ سے آنکھ ملا سکے گی اور اس کی مقبولیت کی وجہ جدید ذہن سے مطابقت رکھتی اور جدید ذہن بدلتی ہوئی کیفیات کے تاثر سے عبارت ہے۔

"شاعر کی زندگی کا ہر لمحہ آرزو اور شکستِ آرزو کی کہانی ہے اور جب شاعر ان
داخلی کوائف و حالات سے متاثر ہو کر انہیں الفاظ کا جامہ پہنانا چاہتا ہے۔ تو نظم
سے بہتر اور کوئی صنف اس کی اعانت نہیں کر سکتی۔ اس لیے کہ یہ صنف کوئی
جامہ صنف نہیں بلکہ داخلی تجربے کو خواہ وہ کسی نوعیت کا کیوں نہ ہو، اپنے اندر
سمونے کی پوری اہلیت رکھتی ہے۔ یہ ایک وسعت پذیر اور لچکدار صنف
ہے۔"(۱۶)

نظم ایسی صنف سخن ہے کہ جس میں شاعر اپنی کیفیتوں کو لفظوں کا جامہ پہناتا ہے۔ یہ صنف نئی ہونے کے باوجود اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ اب یہ جزو نہیں رہی بلکہ اپنی ایک منفرد حیثیت اور "کل" کی حامل صنف کے طور پر جانی پہچانی جانے لگی اور وسعت پذیر کہ یہ شاعری کی ہر صنف کو چھوتی اور متاثر کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

نظم میں روانی اس کی سب سے بڑی خوبی ہے، خواہ وہ جس بھی موضوع پر لکھی جا رہی ہو اور اس میں حیات و کائنات کے موضوعات سمائے ہوئے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح حیات و کائنات کا دامن وسیع ہے۔ اسی طرح نظم کا بھی۔ بالکل اسی طرح نظم کے موضوعات کی وسعت کی کوئی انتہا نہیں۔ اس میں انسانی زندگی کے اوائل کے مراحل

سے لے کر جدید دور تک کے تمام طبقات، واردات، حالات وواقعات، تجربات وکیفیات سب کا بیان نظم میں جذب ہو سکتے ہیں۔ یہ ہی نہیں فکر وخیال کے مختلف شعبے مذہب، اخلاقیات، تہذیب وتمدن، فلسفہ سب کے سب اس میں سمانے کی گنجائش کے قابل ہے۔ نظم کا میدان وسعت کا حامل ہے۔ خواہ وہ ہیئت کے لحاظ سے ہو یا موضوعات کے۔

جب خیال نظم کا موضوع بنتا ہے تو اس میں شاعرانہ کی فن کارانہ پیش کش کا ایسا ذریعہ بنتا کہ وہ کس خیال کو کس انداز سے برتتا۔ کیونکہ شاعر خیال کو خیال میں نہیں بلکہ کی صورت میں الفاظ کا چناؤ کرتا ہے اور شعر کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ نظم ایک مکمل شعری وحدت ہے۔ اس کا ہر فرد اور ہر شعر الگ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ وہ تو محض ایک رنگ، ایک سُر یا آواز ہے۔ جو صرف اسی وقت مزہ دے سکتی ہے جب دوسرے ان گنت رنگوں، سروں اور آوازوں کے ساتھ ترتیب دیا جائے۔

البتہ مانا جاتا ہے کہ اردو نظم دوسری دیگر اصناف سخن کے مقابلے میں کم عمر ہے۔ مگر اتنی بھی کم عمر نہیں جتنا اس کے بارے میں خیال قائم کیا جاتا ہے۔

نظیر اکبر آبادی نے کچھ کم سوا سو سال کی عمر پائی اور سینکڑوں ایسی نظمیں لکھیں جو موضوع و معنی کے لحاظ سے اس زمانے کے مزاج سے الگ۔ اس کی عمر گویا اتنی ہی گردانی جائی جتنی کہ نظیرؔ اکبر آبادی کی۔

> ”اگر ہم نظیرؔ کو اردو نظم کی تاریخ سے ذرا دیر کے لیے خارج کر دیں تو بھی اردو نظم کی عمر سوا سو سال سے کم نہیں ہوتی۔ یہ سوا سو سال ہماری زندگی اور شاعری دونوں میں اس لحاظ سے بہت اہم رہے ہیں کہ اس عرصے میں زندگی نے ایک دو نہیں۔ سینکڑوں کروٹیں لیں ہیں۔ ان کروٹوں نے ہمارے سوچنے، سمجھنے، رہنے سہنے اور ملنے جلنے غرض ہر شعبہ زندگی پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ ان کروٹوں سے پیدا شدہ رجحانات اور شاعری کی دوسری صنفوں میں ملیں یا نہ ملیں لیکن اردو نظم میں وہ بہت صاف نظر آتے“(۱۷)

اردو نظم اپنے سوا سو سالہ تاریخی پس منظر میں چار اہم ادوار سے گزری۔ ایک تو جسے آپ اسماعیل میرٹھیؔ اور حالیؔ سے شروع کر کے بیسویں صدی عیسوی کی دوسری رہائی سے پہلے اختتام پذیر ہوتا جس میں نظم میں ہیئت اور موضوع کے نئے نئے تجربے ہوئے۔

انجمن پنجاب کی تحریک کے زیر سایہ نظم نگاری کا آغاز ہوا۔

دوسرے دور کو بعض وجوہ سے اقبالؔ اور جوش ملیح آبادیؔ سے موسوم کرسکتے ہے۔

تیسرا دور حقیقتاً ترقی پسند تحریک کا دور ہے۔

جبکہ چوتھا دور قیام پاکستان کے بعد سے شروع ہوتا ہے اور آج بھی جاری ہے۔ ان کی ایک خاص بات کہ اس میں زندگی کی معنویت کو تازہ معنی کو پہنانے اور معنی کو نئی زندگی دینے کو شاعری کا حاصل ہے۔

اوّل دور کے نمائندہ شعراء مولانا محمد حسین آزادؔ، مولانا الطاف حسین حالیؔ، اسماعیل میرٹھیؔ، نظم طباطبائیؔ اور نادر کاکوروی کے نام قابل ذکر ہیں اور یہ پہلا دور مغربی تجربات و واقعات اور خیالات کی پیروری کا دور رہا۔ زندگی کے دیگر شعبوں کی طرح اردو نظم پڑھی۔ یہ دونوں تاثر نظر آئے۔ انگریزی خیالات سے ماخوذ اور تراجم شدہ نظمیں اس کا ثبوت ہے۔ نئے نئے منفرد تجربات سے ہمکنار اس دور میں نظم ہوئی اور شعراء نے بھی اس دور کے حالات کو اسی تناظر میں نظم میں بیان کیا۔

دوسرا دور جسے اقبالؒ اور جوش ملیح آبادی کا دور کہا جاتا ہے۔ اس کا آغاز پہلی جنگ عظیم کے بعد سے ہو کر ۱۹۳۶ء کے قریب ختم ہو جاتا ہے۔ اس کو اردو نظم کا ہی نہیں اردو زبان کا بھی رومانوی دور کہا جاتا۔ وہ اس لیے کہ عام روش سے بغاوت، نئے پن کی تلاش، حسن پرستی، مظاہر فطرت کا بیان جیسے رجحانات غالب نظر آئے۔ ان میں مہدی افادی، نیاز فتچوری، ابو الکلام آزادؔ وغیرہ کے مضامین اور اختر شیرانی، جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری کی نظمیں ان سب کی نظمیں خیال و خواب سے بالکل خالی نہیں نظر آئی۔ جبکہ اسی دور کا سب سے اہم نام علامہ محمد اقبالؒ واحد نظر آتے۔ جن کے ہاں جذبات کی فراوانی ملتی ہے۔ جنہوں نے محض خیال و خواب سے نکل کر حقیقت سے آشنا ہو کر جذبات کے موضوعات چُنے۔

یہی نہیں نظم کی ترویج میں ترقی پسند مصنفین کے قلم سے نظم کے تیسرے دور میں نظریات و مقاصد حیات وسیلہ بن گئی نظم کا۔ اس کے نمائندہ نظم نگار شعراء میراجی، ن۔م۔ راشد، فیض احمد فیض، احسان دانش، سردار جعفری اور اختر الایمان جیسی اور بہت سی دیگر شخصیات ہیں۔

یہ دور اردو نظم کی تاریخ کا اہم دور تھا۔ ادب اور اس کے مسائل کا سدِ باب کرنے، سمجھنے پرکھنے اور اردو شاعری کو نئی نئی سمتوں سے روشناس کرنے زندگی پر مختلف زاویوں سے نگاہ ڈالنے اور سب سے اہم نظموں میں جگہ دینے میں اس دور کا بڑا ہاتھ ہے۔

موضوعات کو وسعت دینے۔ شائستہ زبان میں بیان کرنے میں اس دور کے شعراء کی اہم دین ہے۔

> ''اس دور نے ہمیشہ کے لیے یہ بات طے کر دی کہ شاعری اور زندگی کے نظریات میں کوئی بیر نہیں بلکہ زندگی اور شاعری ایک دوسرے سے جتنے زیادہ گتھے ہوئے ہوں گے شاعری اتنی ہی جاندار اور پائیدار ہو گی۔''(۱۸)

اردو نظم کا چوتھا دور جسے دورِ حاضر کا نام بھی دے سکتے۔ ہر طرح سے اردو نظم کی پختگی کا دور کہلاتا ہے۔ جو زندگی کے خاص پہلوؤں ہی کی نہیں بلکہ زندگی کے ہر پہلو کی ترجمانی کرتی دکھائی دیتی۔ یہ صنف ہے ہی اتنی وسعت کی حامل۔ ہر موضوع کو سمیٹ لیتی ہے۔ اس کے نمائندہ شعراء حبیب جالب، سلیم احمد، عزیز حامد مدنی، مجید امجد، انجم اعظمی، وزیر آغا اور عرش صدیقی اور دیگر معتبر نام قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے نظم کو پروان چڑھانے اور نت نئے رنگوں میں سادہ زبان میں کبھی علامتی انداز میں نظم کے میدان میں مزید وسعت کو جنم دیا اور ہر ایک شاعر نے اپنے خاص ڈھنگ سے اس کی آبیاری کی۔

وہ پھر چاہے علامات کا اختراع، معنی کا ابہام اور احساس کی فضا سازی ہو۔ اس دور کی نظموں کا خاصا ہیں۔

> ''اردو نظم کی بعض دوسری صنفوں کی طرح اردو بلحاظ ہیئت و معنی لکیر کی فقیر کبھی نہیں رہی۔ اس نے برصغیر کی تہذیبی زندگی کی ایک بڑی کروٹ یعنی ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کے ساتھ جنم لیا۔ پھر زندگی جیسے جیسے کروٹ بدلتی رہی وہ برابر ان کروٹوں کا ساتھ دیتی رہی۔ چنانچہ اگر کوئی شخص گزشتہ ڈیڑھ سو سال کی اردو شاعری کو زندگی کے رشتوں سے منسلک کر کے دیکھے گا تو وہ محسوس کرے گا کہ اس مدت میں زندگی کی ترجمانی کا حق نظم نے ادا کیا اور صنف نے نہیں۔''(۱۹)

اس جنگ عظیم کے اثرات سے متاثر ہوئے بغیر کوئی بھی شعبہ ہائے حیات نہ رہا۔ تو وہی ادب میں بھی نئے نئے تجربات ہوئے اور شعراء نے ان کو مختلف انداز سے بیان کیا۔ البتہ ہر شاعر نے اپنے اپنے مخصوص انداز بیان و فکر سے اصلاح کا کام کیا اور دوبارہ سے زندگی اور اچھے حالات کی امید دلائی حوصلہ بڑھایا۔ ہر دور میں نظم مختلف حالات سے گزری۔ ہر ایک نے اسے اپنے اپنے انداز سے بیان کیا اور ہر دور میں اس نے ترقی کی۔ لہٰذا انیسویں صدی میں عبدالحلیم

شرر نے اور بیسویں صدی میں شیخ عبد القادر نے "مخزن" کے ذریعے سے اردو نظم میں موضوع کے حوالے سے نئے نئے تجربے کیے اور نظم نگاری کی ترقی کے امکانات روشن دکھائی دینے لگے۔

انیسویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کے اوائل میں اردو نظم کے خدوخال نمایاں ہونے لگے اور اس کی انفرادیت کو مزید استوار، واضح کرنے کے لیے ۱۹۰۳ء میں رسالہ "مخزن" کے ایڈیٹر سر عبد القادر نے "مخزن" کی تین سالہ کارکردگی کا جائزہ لیتے ہوئے صنف نظم کی موضوعی اور ہیئتی لحاظ سے ایک اور اہم جہت کی طرف اشارہ کیا۔ ۱۹۰۱ء میں مخزن کا سنگ بنیاد ڈالی۔

"اس کے جملہ مقاصد میں ایک مقصد اردو نظم میں مغربی خیالات، فلسفہ اور سائنس کا رنگ بھرنا اور نتیجہ خیز مسلسل نظم کو رواج دینا تھا۔ یہ مقصد بھی خاطر خواہ پورا ہوا۔ ظاہر ہے نظم اب موضوع کی قید سے آزاد ہو چکی تھی۔"(۲۰)

نظم میں شاعر اپنے عہد کے کسی مخصوص طبقاتی و ثقافتی گروہ سے بھی ہم کلام ہو سکتا ہے اور عام لوگوں سے بھی۔ اس صنف سخن میں عام و خاص طبقات کا فرق روا نہیں رکھا جاتا۔ بلکہ جو خیال آتا ہے اس کو عام سادہ زبان میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ اردو نظم کا مول دکن بھی کہا جاتا ہے۔ سولھویں، سترھویں صدی میں گول کنڈہ، بیجاپور اور احمد نگر کی ریاستیں اس کے لیے قابل ذکر قرار پائی۔ گول کنڈہ میں قلی قطب شاہیوں اور بیجاپور میں عادل شاہیوں کا راج تھا۔

گول کنڈہ، بیجاپور کے علاوہ دکنی درباری شعراء بھی اس صنف کی ترویج و ترقی میں سرگرم عمل رہے اور اس کے علاوہ دکن میں بھی صنف تجربات ہوتے رہے اور لکھنے والوں نے اس دور کے حالات و واقعات اور انسانوں سے منسلک جذبات و احساسات اور مظاہر فطرت کے موضوعات بھی اس صنف میں سماتے رہے اور یہ صنف سخن ان میں سمائی نظر آتی رہی۔

اور جن میں محمد قلی قطب شاہ، ابراہیم عادل شاہ، میراں ہاشمی، نصرتیؔ، وجہیؔ، غواصیؔ، جنیدیؔ اور ابن نشاطی کے نام قابل ذکر ہیں۔ جنہوں نے اس صنف کو پروان چڑھایا۔

دکنی دور کے بعد کی نظم نگاری میں نظیرؔ کا نام نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔

"اردو میں نظم نگاری کی ان قدیم کاوشوں کی اہمیت اپنی جگہ ضرور ہے۔ لیکن جدید اردو شاعری نے نظم کا مزاج ہی بدل دیا۔ نئے نئے تجربات، نئے سانچے، نئ

ہیئتیں، قافیانہ نظمیں، انفرادی اظہارات اور علمی و فکری موضوعات پر نظموں کی بنیادیں استوار ہوئیں۔"(۲۱)

پھر نظم نے بیسویں صدی کے دور میں قدم رکھا تو اس میں تجربات سے دوچار ہوتی رہی نظم۔ غرض تاریخ کے ساتھ ساتھ ہر دور میں اس صنف کی نشوونما ہوتی رہی اور اس صنف کو برتنے والوں نے جس انداز، لب و لہجے، خوش اسلوب وخوش مزاجی سے اس میں موضوعات جڑے وہ قابل ستائش ہے۔

نظم جہاں جذبات و تخیل کا کارفرمائی ہوتی وہی پر اس میں ملکی، قومی، سیاسی، معاشرتی، معاشی اور دیگر موضوعات بھی اس میں بیان کیے گئے۔ نظم ہر دور میں اپنے ہیئت اور موضوع کے اعتبار سے رواں دواں رہی اور اس صنف نے بھی اثرات قبول کیے۔

"بیسویں صدی کا آغاز اردو نظم نگاری میں ایک نئے دور کا پیشِ خیمہ ثابت ہوا۔ اس انقلابی آہنگ نے اردو نظم کو نئ کروٹ دی اور نئ آواز سے روشناس کیا۔ دامنِ شعری وسیع ہوا۔ موضوعات میں سماجی تغیرات کی علامت جاگی۔ قومی مسائل کو اولیت ملی۔ سیاسی شعور میں پختہ رسی نظر آئی اور بین الاقوامی مسائل کا ذکر شروع ہوا۔"(۲۲)

اس صدی نے نظم کو نئ کروٹ دی اور اس میں یہ ہوا کہ پہلے پہل شعراء صرف انسانی جذبات و احساسات کو موضوع سخن بنائے مگر اس میں ایسی کروٹ لی کہ قومی و سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کا بھی بیان شروع ہوا اور اس روایتی ڈگر سے ہٹ کر شعراء نے اور وسعت دی اس کو اور بین الاقوامی حالات وواقعات کو بھی موضوع سخن بنایا جانے لگا اور اس طرح نظم کا دائرہ کار مزید وسعت کا حامل ہوا۔

"جب ہم اردو نظم کے قدیم و جدید سرمائے پر نظر ڈالتے تو ہمیں اس کا دامن رنگارنگ اور متنوع مضامین سے مالامال نظر آتا ہے۔ مناظر قدرت کا بیان، مختلف موسموں، تہواروں، پرندوں، اور عمارت کا ذکر تاریخی واقعات، حسن و عشق کی چھیڑ چھاڑ، اخلاق اور مذہبی موضوعات، سماجی، سیاسی، قومی، معاشی مسائل فلسفیانہ رموز و نکات غرض حیات و کائنات کے کم و بیش سبھی گوشوں کو ہماری نظم نے

اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ نظم کا ارتقاء بتدریج ہوا۔ جیسے
سماجی شعور نے ترقی کی اسی طرح نظم کے مضامین میں بھی وسعت پیدا ہوتی
گئی۔"(۲۳)

جیسے جیسے نظم نے حالات و واقعات، تاریخی واقعات، بین الاقوامی منظر میں تبدیلیاں رونما ہوئی ساتھ ساتھ نظم پڑھی اس کے اثرات مرتب ہوئے۔ دوسرے جس طرح ادب اور دوسری صنف اور لوگوں پر اس کے اثرات ہوئے اسی طرح نظم بھی ان اثرات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہی اور ان سب حالات و واقعات کی بدولت شعراء کے ہاں ہر شاعر نے ان کو اپنے اپنے تخلیقی ہنر اور زبان و بیان میں پرویا نظم کی صورت میں۔

لہٰذا ۱۹۴۷ء سے لے کر اب تک نظم کے سبھی رجحانات و واقعات کو ایک ہی میز پر سمیٹا جا سکتا ہے اور وہ ہے پاکستانی معاشرہ اور یہ سب رجحانات و واقعات جو سابقہ بیان ہوئے وہ معاشرے کے پیدا کردہ رجحانات ہی ہے اور سیاسی، سماجی، معاشی اور قومی رجحانات کو پروان چڑھایا اور اگر پاکستانی نظم کی روایت کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں اردو نظم میں زبان و بیان، موضوع، خیال، جذبہ، اور مواد وغیرہ میں بہت سی تبدیلیاں دکھائی دیتی۔ گویا غزل کی بہ نسبت نظم نے عالمی تحریکوں کے اثرات قبول کیے اور خود وسعت کی خوبی سے ہمکنار ہوئی۔ اس میں اب کوئی بھی خواہ انسانی جذبات و کیفیات کا بیان ہو یا پھر بین الاقوامی رجحانات ہو یا قومی و ملی، سیاسی، سماجی، سائنسی، فلسفیانہ سب کا سب بیان اب نظم کے اندر سموئے جا سکتے اور شعرا ان سب کو ایک لڑی میں پرو بھی رہے اور نظم اپنی ایک الگ صنف کے اعتبار سے جانی جانے لگی اب۔

"اردو نظم نے عہد بہ عہد نئے رنگ و آہنگ اور فکری، فنی اور لسانی عناصر کے
ذریعے خود کو امر کر لیا۔ نظم کا یہ سفر جاری و ساری ہے۔ خارجی و داخلی موضوعات
نئے عہد کے تقاضوں سے بھی خود کو متعین کیا۔"(۲۴)

آج پاکستانی نظم اہل وطن کی سیاسی بیداری اور سماجی شعور اور نظریاتی وابستگی کی عکاس رہی ہے۔ اور اب بھی یہ اپنے نئے نئے موضوعات اور اسلوب، زبان و بیان، لب و لہجے، رنگ و آہنگ کے حوالے سے نئے نئے مراحل طے کر رہی ہے۔

نظم کی کوئی مقررہ شکل یا مقررہ ہیت نہیں ہوتی۔ نظم کے لئے بہر حال یہ ضروری ہے کہ خیال یا معنی کے اعتبار سے اس میں تسلسل ہو، اور ایک شعر دوسرے شعر میں پیوست ہوتا چلا جائے۔ نظم میں موضوعات کے لحاظ سے بہت وسعت کی حامل صنف ہے۔ جس میں کائنات سے لے کر اور اس میں رونما ہونے والے واقعات و حالات و تجربات کو نہایت ہنر مندی سے موضوع سخن بنایا۔

حوالہ جات

۱. سنبل نگار، ڈاکٹر، اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ، لاہور: زبیر بکس، س ن، ص

۲. ایضاً، ص۲۱۶

۳. وزیر آغا، ڈاکٹر، نظم جدید کی کروٹیں، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص۲۱

۴. صاحبزادہ حمید اللہ، فن اور تکنیک، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء، ص۹۶

۵. نظم کی دریافت

۶. حامد کاشمیری، ڈاکٹر، جدید اردو نظم اور یورپی اثرات، دہلی: ۱۹۶۸ء، ص۲۸

۷. حفیظ صدیقی، ابوالاعجاز، کشاف تنقیدی اصطلاحات، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء، ص۲۶۷

۸. نظم کی دریافت، ص۴۷

۹. حامد کاشمیری، ڈاکٹر، جدید اردو نظم اور یورپی اثرات، دہلی:، ۱۹۶۸ء، ص۱۹

۱۰. ایضاً، ص۲۳

۱۱. ایضاً، ص۲۹

۱۲. ساحل احمد، ادب و عصر (مضامین)، الہ آباد: اردو رائٹرس گلڈ، ۲۰۰۵ء، ص۱۸۰

۱۳. فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو شاعری کا فنی ارتقاء، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۶ء، ص

۱۴. انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، ص۳۳۸

۱۵. حامد کاشمیری، ڈاکٹر، جدید اردو نظم اور یورپی اثرات، دہلی: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۰ء، ص۲۳

۱۶. ایضاً، ص۲۷

۱۷. فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، نیا پرانا ادب، کراچی: قمر کتاب گھر، ۱۹۷۴ء، ص۲۲۰

۱۸. ایضاً، ص۲۲۲

۱۹. ایضاً، ص۲۲۴

۲۰. حامد کاشمیری، اردو نظم کی دریافت، ۲۰۰۴ء، ص۲۵

۲۱. محسن عباس، ڈاکٹر، وزیر آغا کی نظم نگاری، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۴ء، ص۴۲

۲۲. ساحل احمد، ادب و عصر (مضامین)، الہ آباد: اردو رائٹرس گلڈ، ۲۰۰۵ء، ص۱۸۳

۲۳. ایضاً، ص۱۹

۲۴. سکندر حیات میکن، ڈاکٹر، اردو شاعری پر تحقیق، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۷ء، ص۱۲۵

باب سوم

شہزاد احمد کی نظموں کا فکری مطالعہ

باب سوم

شہزاد احمد کی نظموں کا فکری مطالعہ

اردو ادب میں شہزاد احمد کا شمار پاکستان کے ان شعراء و ادباء میں ہوتا ہے جن کا بنیادی وصف سوچنا ذہن اور وجدانی وجود ہے۔ اس سے پہلے کہ شہزاد احمد کی نظموں کا فکری و صنّی مطالعہ کرے تو چند حقائق کا اظہار خیال کرنا مناسب ہے۔ شہزاد احمد انے اپنے مجموعوں میں بعض بہت مختصر، بعض درمیانی، جبکہ طویل نظمیں اور قطعات بھی شامل کیے۔ جو کہ کہیں معاشرتی، نفسیاتی اور کہیں جمالیاتی فکر کو بھی ملحوظ خاطر رکھا۔ ''دیوار یہ دستک'' کے نام سے شہزاد احمد کا پانچ مجموعوں پر مشتمل مجموعہ ہے۔

شہزاد احمد کے ہاں نئی نئی راہیں ہموار ہوتی دکھائی دیتی سوچ کی۔ شہزاد احمد کا پہلا مجموعہ ''صدف'' جس میں صرف غزلیں پائی جاتی ہے۔ شہزاد احمد کا دوسرا مجموعہ ''جلتی بجھتی آنکھیں'' بھی غزلوں پر مشتمل شہزاد احمد کا مجموعہ ہے جو کہ ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا۔ جس میں چند قطعات شامل ہے۔ وہ بھی منفرد اور اچھوتا لب و لہجہ کا بیان ملتا ہے اور وہ قطعات بھی شہزاد کی فکر کے بیش قیمت موتیوں میں سے ایک موتی کی مانند لگتے ہیں۔

شہزاد احمد کا تیسرا مجموعہ ''ادھ کھلا دریچہ'' شہزاد احمد کا تیسرا مجموعہ ہے۔ جس میں چند نظمیں پائی جاتی ہے۔ باقی کثیر تعداد میں غزلیں ہے اور یہ ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا۔ اس میں (اپریل ۱۹۵۸ء سے جولائی ۱۹۶۸ء تک) کے دور کی نظمیں اور غزلیں شامل ہے۔ تعداد کے لحاظ سے سولہ نظمیں ان مجموعے میں ہے جو کہ مزاج کے لحاظ سے رومانی ہے اور رومانوی مزاج کسی ''سانولی'' سے تعلق کے اظہار کی مانند ہے۔ شہزاد احمد کی یہ نظم رومانوی ہونے کے ساتھ ساتھ منفرد انداز کی بازیافت معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً

اس کا سلونا جسم
کہ جیسے دھوپ کو رنگت مل جائے
جیسے دھوپ کی تیز شعاعیں
چمک چمک سنّولائیں
پھر یہ سنّولائی ہوئی کرنیں

اک پیکر بن جائیں
اس پیکر کو جب بھی دیکھیں
سانولی کہہ کر بلائیں (۱)

(سانولی، ص)

اس مجموعے میں رومانیت انداز اپنائے جو کہ اپنا اچھوتا انداز اپنی مثال آپ ہے۔ خوبصورت پیرائے میں سانولی کے نام سے اس سے تعلق کے اظہار کی صورت نظر آتی ہے۔

جہاں شہزاد کہ ہاں رومانیت پائی جاتی نظموں میں وہیں پر ان کے ہاں ان کی فکر کے نئے نئے موضوع مختلف زاویوں میں نظر آتے ہیں۔ تو کہیں وہ خود سے، ماضی سے اور جسم کے اندر بسی روح کی کشمکش میں گھیرے ہوئے نظر آتے ہیں اور اسی میں ڈوب کر اپنی فکر کو لفظی جامہ پہناتے ہوئے اور کہیں جسم کو لفظوں سے باندھ لیتے ہوئے یادِ ماضی کی فکر کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ ان کی فکر کا یہ انداز ان ہی کا مرہونِ منت ہے۔ جو ان کو دوسروں سے الگ مقام دلاتا ہے۔ کبھی خود سے تو کبھی اپنی یادوں سے ہم کلام ہوتے نظر آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نظم "یادوں کی زنجیر"

اپنے آپ سے لڑتے لڑتے ایک زمانہ بیت گیا
اب میں اپنے جسم کے بکھرے ٹکڑوں کے انبار پہ بیٹھا
سوچ رہا ہوں
میرا ان سے کیا رشتہ ہے؟
ان کا آپس میں کیا رشتہ ہے؟
کون ہوں میں؟ (۲)

(یادوں کی زنجیر، ص۶۱۹)

یہاں پر خود سے سوال کرتے دکھائی دیتے ہے وہیں پر ان کی فکر نئے موڑ لیے ہوئے نظر آتی ہے۔ انسان نے دنیاوی آسائشوں میں رہنا سیکھ لیا اور دنیا کے جھمیلوں میں ایسا مگن نظر آتا ہے کہ جسم کے اندر مخفی روح کا کوئی سامان ہی نہیں کیا۔ جسم کی بھوک پیاس مٹانے میں مگن نظر آتا ہے کہ روح کی بھوک پیاس بجھانے کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں۔ ان کی فکر کا یہ پہلو دل کو چھو جانے والا کہ انسان نے باہر کی دنیامیں تو عیش و آرام کیا مگر روح کا خیال ہے بھی کہ نہیں۔ اگر کبھی مشکل حالات کا سامنا ہوا اور اگر کبھی جاڑے کی سختیوں کی شام آگئی تو تیرا بدن یہ جھیل پائے گا کیا اور تیری روح کو

سامان نہ ہو گا اور یہ دنیاوی آسائشیں تیری روح کو روشن نہ کر پائے گی اور تیری روح کہیں کھو جائے گی، جو کہ ان کی یہ فکر نظم "تاریک روح" میں نمایاں ہے۔

"یہ سولہ نظمیں بیش تر مختصر ہیں اور زندگی کے سرسری اظہار پر مشتمل ہیں۔"(۳)

شہزاد احمد کی "سایہ" یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کسی کی یاد یادوں کا سایہ معلوم ہوتی ہے اور یہ فکر کہ اس نظم میں شہزاد احمد نے آغاز سے لے کر انجام تک محبوبہ کے حسن و ادا اور یادوں کو انتہائی عمدگی سے بیان کیا ہے۔ تنہائیاں، میل جول، رعنائیاں سبھی کا بیان ہے۔ اس نظم کے آخری دو مصرعے نہایت دلفریب اور سوچ میں پڑنے والے ہیں۔

پھر بھی ہم یک جان ہیں، قالب بھی اپنے دو نہیں
میری آنکھوں نے اسے دیکھا ہو یہ بھی تو نہیں(۴)

(سایہ، ص ۶۳۱)

اس مجموعے کی نظمیں یوں محسوس ہوتا کہ جیسے ایک نوجوان محبت کا شکار ہو گیا ہو اور اس مجموعے کی سب نظمیں محبت کی کہانی معلوم ہوتی ہے اور جو انتہائی سادہ مگر منفرد انداز میں لپٹے ہوئے الفاظ کی صورت میں مختلف تفصیلات کے ساتھ ملتی ہیں۔ اور کبھی خود سے تو کبھی محبوبہ سے ہم کلام ہونے کا بیان ملتا ہے۔ انتہائی عمدگی سے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتے معلوم ہوتے کہ پڑھنے والوں کو یوں معلوم ہوتا کہ یہ میری ہی کہانی ہے۔ سوچ تو نئی راہیں اپنائے ہوئے ہے ہی مگر الفاظ کا چناؤ کمال تو کہیں پر خالقِ حقیقی سے باتیں کرتے ہوئے نظر آتے۔

میرے ذرے خس و خاشاک میں مل جائیں گے
کسی بپھری ہوئی آندھی کی طرح آئیں گے
تیرے دامن سے لپٹ جائیں گے۔۔۔ (میں جسے چھو نہ سکا)(۵)

(نارسا، ص ۶۳۳)

اس مجموعے کی دو نظمیں معریٰ نظم کی ہیئت میں ہیں اور یوں دیکھ کہ لگتا جیسے یہ آزاد نظمیں ہو۔ نظم "تنہائی کے بعد" اور "سایہ" بھی جو کہ مسدس کی ہیئت میں ہے۔ پانچ بندوں پر مشتمل ہے۔ انتہائی حسین نظم جس میں شہزاد احمد نے کیا فکر اپنائی۔ تنہائی اور اس تنہائی میں در پیش آنے والے لمحات و احساسات کا بیان یوں معلوم ہوتا۔ محبوبہ سے دوری اور اس دوری میں تنہائی بھی ساتھ دونوں کا ملاپ کی اس نظم میں تصویر کشی کی گئی نت نئے انداز میں پیرائے میں۔

وقت ہے ناگ تیرے جسم کو ڈستا ہوگا
دیکھ کر تجھ کو ہوائیں بھی بپھرتی ہوں گی
سب تیرے سائے کو آسیب سمجھتے ہوں گے
تجھ سے ہمجولیاں کترا کے گزرتی ہوں گی
جو تنہائی کے احساس سے روتی ہوں گی
کتنی یادیں ترے اشکوں سے ابھرتی ہوں گی(۶)

(تنہائی کے بعد، ص۶۲۶)

شہزاد احمد زندگی کو کبھی حقیقت کی آنکھ سے دیکھتے ہے تو کبھی یوں لگتا کہ تصوریت کے جھروکے سے دیکھتے نظر آتے۔ شہزاد احمد کے مذہبی تہواروں کے حوالے سے بھی نظم لکھی "کرسمس کا درخت" کے نام ہے۔ یہ نظم رومانوی فن پارے کی عمدہ مثال ہے۔ نہ ہی اس میں خود کے ذاتی تجربے کو بیان کیا شاعر نے بلکہ اس میں یوں معلوم ہوتا ہے کہ کرسمس کے درخت کی روداد بیان کی گئی ہو۔ فکر موضوع عمدہ ہے مگر ساخت کے اعتبار سے نظم بہت حسین ہے اور کیسے اس درخت کو لایا جاتا گھر کی رونق کو بڑھایا جاتا، جذبات اُمڈتے اس موقع پر، اس کی اہمیت اور بڑھادی جاتی مگر بعد میں یہی بیکار شے کی مانند قرار دیا۔ شہزاد احمد کا یہ فکری لب و لہجہ جو کہ ایک درخت بلندی و پستی کا بیان ہے۔ انتہائی اعلیٰ۔

جب گزر جائے گی سب
بٹ چکے گے سارے تحفے، بجھ چکیں گے بلب سب
میں ڈرائنگ روم کی بیکار شے ہو جاؤں گا
میرے سکھے زرد پتوں کی مہک
جاگتی جیتی فضا میں کب تلک؟
وہی خوشیوں کا مانند بھی ہے یہ درخت یہاں افسردگی کا مرہون منت
میں بھی ہوں گویا کرسمس کا درخت
میرا رشتہ بھی زمیں سے، آسماں سے اور ہوا سے کٹ چکا
باغ چھوٹا، کھیتیاں چھوٹیں

میں گھر کے مرکزی کمرے میں آکر ڈٹ چکا
میرے بچوں نے سجایا ہے مجھے
روشنی کے ننھے بلب ٹانکے ہیں مری بانہوں کے ساتھ
میری شاخوں ہیں تحفے
مختلف رنگوں کے کاغذ اور سنہرے ٹیپ میں لپٹے ہوئے
ہے رقم ہر ایک تحفے پر کوئی مانوس نام (۷)

(کرسمس کا درخت، ص)

کیسے ایک درخت جو خوشی کا سامان بنتا ہے اور خود وہ اس چند لمحوں، گھنٹوں کی خوشی کا باعث بننے کے بعد بیکار شے بن جاتا ہے۔ اس کی کوئی وقعت باقی نہیں رہتی۔

شہزاد احمد کے ہاں ان کی سوچ / فکر کیا کیا موضوع اپنائے اور لفظوں کا میل جول سب یوں معلوم ہوتا ہے جیسے بکھرے ہوئے موتی یکجا ہو رہے۔ کہیں وقت کی قدر، کہیں محبوبہ سے میل ملاپ، تنہائی جدائی تو کہیں حقیقت سے روبرو سب مل کر اس مجموعے میں سمٹ آیا ہے۔

کہیں فکر کا دھارا اتنی وسعت کا حامل ہے تو کہیں معمولی موضوع کو یوں بیان کیا کہ اس کی معمولیت میں اضافہ ہوتا اتنے خوبصورت انداز میں بیان کیا۔ رات، غم، پھر سے نئے سرے سے نمود، کہیں تنہائی، لمحوں کی بازیافت، کہیں اجنبی غم، وقت کا ہاتھوں سے گزرنا، اس کی قدر و قیمت، تو کہیں وقت کا ظلم، رات دن کا بدل بدل کر آنا سب کا بیان نہایت عمدگی سے کیا۔ سوچ ایک مرکز پر رکی ہوئی نہیں معلوم ہوتی۔ کائنات کی وسعت کی سوچ بچار کا بیان ملتا ہے۔

راتوں کے قدموں کی آہٹ کس کو سنائی دیتی ہے؟
قافلہ انجم کو کس نے خاک اڑاتے دیکھا ہے؟
کس کو خبر کہ گلزاروں میں پھول کہاں سے آتے ہیں؟
منزلِ مہر و ماہ کہاں ہے یہ کس کو معلوم ہوا؟
لیکن راتیں آتی جاتی رہتی ہیں (۸)

(اجنبی غم، ص ۶۴۷)

شہزاد احمد کے ہاں ان کی فکر مختلف رنگ ڈھنگ اپنائے ہوئے۔ موضوعات کی دلفریبی دیدہ زیب ہے۔ تو کبھی پھر سے امید کی کرن جگتی ہے۔ وہ امید کوئی بھی ہو سکتی ہے۔ امید جو کہ مختلف انداز میں الفاظ کے لباس میں لپٹی ہوئی ہے۔ وقت اور اس کی رفتار سورج اس کی تمتماہٹ، دن اور رات کا آنا جانا مقررہ وقت پر سب اپنے آپ میں ایک امید ہے۔ پھر سے نکل آتے ہیں ڈوبنے کے بعد۔

کھلتے ہوئے سرکشیدہ پودے
ہاتھوں کو ہلا کر کہہ رہے ہیں
اے دوڑتے وقت کے پیمبر
جھکے ہوئے پیڑ کو بنا دے
ٹوٹی ہوئی شاخ کو سنا دے
یخ بستہ سمندروں سے کہہ دے
ان کہر کی چاروں کے پیچھے
سورج کی تمازتیں جواں ہیں
اور وقت کے قافلے رواں ہیں (۹)

(نئی پود، ص۶۴۹)

شہزاد احمد کا یہ شعری مجموعہ اور اس کی نظمیں مختلف موضوعات منفرد رنگ ڈھنگ اپنائے تو کہیں محبت کی چاشنی ہے، کبھی تنہائی، تو کبھی حسن کی دلفریبی اور محبوبہ کی حسن و جمال کو نت نئے رنگوں اور موضوعات میں بیان اپنی مثال آپ ہے۔ یہی آپ کی خاصیت ہے جو آپ کو دوسروں سے الگ پہچان دلاتی ہے۔

بنے گی اب ورقِ شب پہ کون سی تصویر
ستارے ڈوب چکے، آسمان خالی ہے (۱۰)

شہزاد احمد کا شعری مجموعہ "خالی آسمان" اس مجموعے میں تیس نظمیں شامل ہیں۔ اگر نظموں کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ کم و بیش ایک پورے مجموعے جتنی بنتی ہے۔ گویا انہوں نے ۱۹۷۶ء کی نظمیں آغاز میں شامل کی ہیں۔ اور بتدریج ۱۹۵۱ء کی نظموں تک گئے ہیں۔ آخری نظمیں پہلے اور ابتدائی نظمیں آخر میں شامل کی ہیں۔ حصہ نظم پچاس اور ساٹھ اور ستر کی دہائی کے ابتدائی دو سالوں کی نظموں پر مشتمل ہیں۔

"پچاس کی دہائی کی نظمیں مجموعی طور پر رومانی، ساٹھ کی دہائی کی نظمیں بیش تر فلسفہ و نفسیات اور سائنسی موضوعات اور ستر کی دہائی کے ابتدائی دو سالوں کی نظمیں سیاسی و انقلابی موضوعات پر مشتمل ہیں۔ یہ موضوعات جہاں ان کے عہد کی عکاسی کرتے ہیں۔ وہاں خود شہزاد احمد کی فکری زندگی میں آنے والی تبدیلیوں کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔"(۱۱)

شہزاد احمد کا یہ شعری مجموعہ کلام انتہائی توانا منفرد انداز کا ہے۔ اس مجموعے میں بے شمار موضوعات سمیٹے ہوئے ہیں۔ ان نظموں میں پاکستان پر ڈھائی جانے والے مظالم، قتل و غارت، بے حیائی و بے غیرتی کی انتہا کی روداد ہے۔ یہ سب موضوعات کو نظم میں سمونا قابل قدر ہے۔ آنکھیں صرف آنکھیں نہیں ان آنکھوں نے ظلم و ستم کے جو پہاڑ ڈھائے ان کو دیکھا ہے اور سب نے ظلم و ستم کو ڈھاتے ہوئے دیکھا۔

کیا فقط دیکھتے رہتے مسائل کی گرہ کھلتی ہے؟
کیا فقط آنکھ کی پتلی میں ہے محفوظ خدائی ساری؟
ہم کہ انساں نہیں آنکھیں ہیں
ہم نے آنکھوں کو خدا سمجھا، خدائی جانا
آئینہ دیکھا تو ان آنکھوں نے خود کو بھی نہیں پہچانا(۱۲)

(ہم کہ انسان نہیں آنکھیں ہیں، ص۷۶۶)

ظلم سہنے والوں کی آہ و پکار کو شاعر نے بے حد عمدگی سے بیان کیا ہے۔ کہ انسان کی کوئی وقعت نہیں جو اتنے ظلم ڈھائے جا رہے۔ انسان نہیں ہے کہ جو اتنے مظالم ڈھائے کیا بس دیکھتے رہنے والی آنکھیں ہیں۔

ذات کے گرد خدائی کے مناظر سے
مناظر میں چھپی صدیوں کی مظلوم تمناؤں سے!
چھوڑ دو آنکھیں
ہم تماشائی دیکھنے والی نہیں کھیل کے کردار بھی ہیں
اپنے کردار کے زندان میں گرفتار بھی ہیں
ہم سے زندانی ہزاروں لاکھوں۔۔۔(۱۳)

(ایضاً، ص۷۶۷)

"پچیسویں سال کا عہد نامہ"، "بدلتے ناموں کی داستانیں"، "جو زخم سینے پہ لگ چکا ہے"، "ظالمو یوم حساب آ پہنچا" ان نظموں میں بلند آہنگ اور انقلابی فضا پائی جاتی ہے اور پاکستان کے مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کی داستاں ہیں یہ تمام نظمیں۔

اور اپنے آپ ہی سے برسرِ پیکار ہیں
اس لڑائی میں ہزاروں بار ہم مارے گئے
شمع کی مانند اپنے آپ پر وارے گئے
اس لڑائی کا سبب ہم سے پہچانا گیا
حاکمانِ شہر کو مجرم نہ گردانا گیا
ہم تو ان گرتی فصیلوں کا سہارا ہو گئے
یعنی اس کاخِ ستم کا اینٹ گارا ہو گئے (۱۴)

(پچیسویں سال کا عہد نامہ، ص۷۶۹)

اس مجموعے کی ہر نظم فلسفیانہ فکر و احساس، ادراک، تخلیقی عمدگی سب نمایاں نظر آتا ہے۔ موضوعات منفرد و جامع۔

زمین کے بے تاج بادشاہوں نے ہم کو لوٹا ہے قریہ قریہ
ہماری جھولی میں بھیک ڈالی ہے
یہ واہمے ہی ہمارے گھر ہیں
ہم ان گھروں میں کئی زمانوں سے رو رہے ہیں
گھروں کی دیواریں رفتہ رفتہ سمٹ رہی ہیں
چھتیں دھماکوں سے پھٹ رہی ہیں
ہم ان کے ملبے میں دب رہے ہیں
قرن قرن جاں بہ لب رہے ہیں (۱۵)

(بدلتے ناموں کی داستانیں، ص ۷۷۲)

ان نظموں سے یوں معلوم ہوتا جیسے کہ ایک نظم میں اس مظالم کو دیکھنے والے انسانوں کی آنکھیں شواہد ہیں۔ تو دوسری میں ظلم ڈھانے والوں کی بے رحمی و سنگ دلی کا بیان، تو تیسری میں مظالم کی آہ و پکار کیسے کیسے مظالم کا شکار ہونے کا بیان ہے۔ جس مہارت سے ان سب کا بیان نظر آتا اپنی مثال آپ ہے۔

خدائے برتر یہ تیرے بندوں نے کیا کیا ہے؟
یہ جنگ کیوں ہم پہ کی ہے وارد؟
کہ جس کے شعلوں سے اور صداؤں سے کانپ اٹھا فلک کا گنبد
خدائے برتر ہمیں خبر ہے کہ امتحاں اب کے سخت ہو گا
جہاں لڑی جائیں گی یہ جنگیں وہاں نہ کوئی درخت ہو گا
نہ گھاس کا زرد کوئی تنکا ہی مدتوں تک دکھائی دے گا
تمام کانوں کو شورِ عبرت سنائی دے گا
ہر ایک بندہ ترے کرم کی دہائی دے گا![۱۶]

(جو زخم سینے پہ لگ چکا ہے، ص ۷۷)

ہمیں خبر ہے کہ فتح تیرے کرم سے ہو گی۔۔۔ ضرور ہو گی
مگر جو اک زخم اپنے سینے پہ لگ چکا ہے نہ بھر سکے گا[۱۷]

(ایضاً، ص ۷۸)

اے خدا تیرا نام لے کر
یقین ہمیں امن کا دلایا
گواہ تجھ کو اگر بنایا۔۔۔ ہم اپنے ہاتھوں کو روک لیں گے
مگر خدائے بزرگ و برتر گواہ رہنا
جو زخم سینے پہ لگ چکا ہے وہ حشر تک اب ہرا رہے گا[۱۸]

(جو زخم سینے پہ لگ چکا، ص ۸۱)

تو ایک نظم علیحدگی کے وقت ہوئے عذاب اور جو ظلم ہوئے آزادی کے وقت ان سب کی تصویر کشی کی گئی۔ یوں لگتا ہے ظلم و ستم کے پہاڑ ڈھانے کے بعد ان کو کوئی پوچھنے والا حساب لینے والا نہیں۔ ہر ظلم و زیادتی کا حساب ہو کر رہے۔ اس پس منظر کی مثل یہ نظم ہے۔ جس کے عنوان اور موضوع سے ہی معلوم ہو تا ہے۔

ظالمو یوم حساب آ پہنچا
سب سوالوں کا جواب آ پہنچا
تم نے بھی ظلم کے ارمان کیے تھے پورے
اب کے تم پر بھی عذاب آ پہنچا(۱۹)

(ظالمو یوم حساب آ پہنچا، ص ۸۲)

باغ سے، پھول سے، مٹی سے یہ آتی ہے صدا
ظالمو یوم حساب آ پہنچا
سب سوالوں کا جواب آ پہنچا(۲۰)

(ایضاً، ص ۸۵)

یہ سب تو ایک طرح سے زخم خوردہ پاکستانیوں کے لخت و جگر کی پکار ہے اور کچھ نظمیں تو ۱۹۷۲ء کے انتقام کے موضوعات پر مبنی ہے۔ اس مجموعے میں شہزاد احمد نے ایک نظم قائداعظم کی یاد میں لکھی جو انتہائی سادہ عام فہم معلوم ہوتی۔

دوام ہو مری مٹی بھی، اس کی خوشبو بھی
شجر جو تو نے لگایا سدا پھلے پھولے
تیرے ہی عزم کی قندیل ہاتھ میں لے کر
چلے تو تیرا مسافر نہ راستہ بھولے
زمیں سے تا بہ فلک سلسلہ رہے قائم
زمیں کا یہ شجر آسمان کو چھو لے(۲۱)

(سفر تمام نہ ہو قائداعظم کی یاد میں، ص ۹۰)

اس مجموعے کی دیگر چند نظمیں عام موضوعات کا بیان معلوم ہوئی۔ کہیں امید کی کرن تو کہیں اپنی جڑوں سے کٹنا، اپنی بنیادوں سے دوری وغیرہ وغیرہ۔ ایسے موضوعات ملتے ہیں۔ ایک نظم تو فرسودہ رسم ورواج کی بیڑیوں کا منظر دکھائی دیتی۔ بلاوجہ کی پابندیاں جس میں نہ کھل کر سانس لے سکتا ہے نہ ہی آزاد ہو سکتا ہے۔ پرانی روایات اور ان پر عمل کرنے کی تاکید اور ان میں جکڑے رہنے کی اذیت ان جیسے موضوعات پائے جاتے جیسے کہ نظم ''مجھے آزاد کر دو''، ''ایک درخت''، ''گامزن'' اور ''خاک کے روپ'' سب جامع انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

کبھی یہ انسان آسمان کی بلندیوں کو چھوتے اور اس سے بھی آگے کے جہان میں جانے کے لیے پر جوش نظر آتا ہے۔

کہیں پر انسان کے بے ڈھنگے پن کا بیان ملتا۔ انسان فیشن تو نت نئے اپناتا ہے مگر اپنے ننگے پن پر شرمندہ نہیں اور کتنے کتنے داموں یہ لباس خریدتا ہے۔ ہماری آنکھیں بھی شرمندہ نہیں ہوتی۔ اس سب کا بیان نظم ''برہنگی'' میں ملتا ہے۔

شہزاد احمد کی نظموں میں موضوعات وسعت کے حامل ہیں۔ انسان جو کہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتا ہے۔ آسمان کی بلندیوں سے آگے ستاروں سے آگے کے جہان کی جستجو میں مگن نظر آتا۔

اے جہان دور میری آرزو
کم نہ ہو گی بال و پر کی جستجو
دیکھنے ہیں تیرے رنگ روبرو
کرے گی میری خاک تیری چوٹیوں سے گفتگو۔۔۔ کبھی
مگر ابھی۔۔۔ یہ روشنی مرے نصیب میں نہیں
ابھی طنابِ وقت ہے کھنچی ہوئی
کھڑا ہے خیمہ فلک [۲۲]

(جہانِ دور، ص ۸۰۵)

کچھ حقیقت پر مبنی موضوعات کی بھی نظمیں ہیں۔ تخلیق کائنات سے کلام کرتی نظر آتی ہے۔ فلسفیانہ انداز اپنائے ہوئے۔ اس مجموعے کی نظموں کا شاعرانہ آہنگ بھی قابل تعریف ہے۔ یہ سائنس اور فلسفے کے گہرے ادراک سے تخلیق ہوئی نظمیں ہیں اور فلسفیانہ فکر و احساس کا عنصر نمایاں ہیں۔

ایک نظم جس میں یوں معلوم ہوتا جیسے خالق اور مخلوق کے رشتے کو فلسفیانہ نقطۂ نظر سے دیکھا گیا اور اہم سوالات اٹھائے گئے ہوں۔ اس نظم میں فلسفیانہ بصیرت وشاعرانہ احساس کے رنگ دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس سب کی مثال یہ نظم:

ایک پل میں ختم ہو سکتی ہے وسعت کی دہر
چوٹیوں سے چوٹیوں تک راستہ
آگے خلا
اور خلا کی تیرگی میں دور سے آتی ہوئی کرنوں کے رنگوں کی نمود
آسماں کے پاؤں پر مہتاب وانجم کے سجود
اور زمین کی رونقوں کا وہم فکرِ رفت وبود
وہ تو خواس خیر وشر کے جال میں الجھا ہوا
درد سے بے تاب تخلیقِ اذیت سے نڈھال
چیخ کر کہتا ہے "مجھ کو مار ڈال (۲۳)

(زہریلی تخلیق، ص۸۲۸)

اس مجموعے میں زیادہ تر طویل نظمیں پائی جاتی ہیں۔ شہزاد احمد کے ہاں ظلم وجبر کے خلاف احتجاج نہ کرنا بذاتِ خود ظلم کرنے کے مترادف ہے اور اسی لیے وہ ہمیشہ ان کی نظموں میں جواں مردی سے غیرت سے جینے کا پیغام دیتے۔ نظم "گریزاں" اس فکر بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان مشین کی مانند ہو گیا ہے۔ اسی لیے شہزاد احمد اخلاقیات وانسان کی قدر واہمیت پر زور دیتے ہیں۔ جتنی آسائشیں ملیں اتنا ست روی کا شکار ہو گیا انسان۔ خود کے وجود کی کوئی وقعت نہیں رہی۔ جب انسان کی تقدیر کی ہوا چلی اور اس سے پہلے انسان کانچ کے ٹکڑے کی مانند تھا۔ رب نے اسے بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے۔

اس میں کچھ نظمیں نثر کا نمونہ لگتی ہیں۔ نثری ہیئت میں لکھی ہوئیں۔ نظم "ماورا" خیال کی اعلیٰ سطح کی نظم ہے۔ جس میں امید، وقت تیز رفتاری کا بیان ملتا ہے۔ شہزاد احمد کے ہاں موضوعات میں تنوع ہے جو کہ ایک سے بڑھ کر ایک ہے اور ایک سے ایک اچھوتا نیا پن کا احساس ہوتا۔ فلسفیانہ فکر وانداز میں بیان کر قابل تعریف ہیں۔

شہزاد احمد کی نظموں میں زمین اور زمین زادوں کی عظمت کے گیت بھی سنائی دیتے محسوس ہوتے ہیں۔ زمین اور اس پر رہنے والوں کی بے حسی، غرور، لالچ کا بیان نظر آتا ہے۔ شہزاد احمد نے جس انداز سے ان سب کو سمویا ہے اس سب کی مثال یہ نظم کی چند سطریں:

اور یہ دھرتی مہکتے سبز رنگوں کا جہاں
رات کو مہتاب کی چادر میں لپٹی آبشار
دن کو سورج کی شعاعوں سے دہکتی جوئے بار
اس کے رنگا رنگ ہنگاموں میں روحوں کی صدا
اس کی ویرانی میں بھی آبادیوں کا سلسلہ
اپنی اس تخلیق پر خود مسکراتا ہے خدا
رات دن تارے اسی کو گھورتے رہتے ہیں اور تھکتے نہیں (۲۴)

(ستارے اور زمین، ص ۸۳۹)

اس مجموعہ کی ایک نظم "کیمیا" غزل کی ہیت میں بندوں پر منقسم۔ "ستارے اور زمین" پابند نظم کی صورت۔ اس میں جب پہلا مارشل لا لگا۔ ایوب خاں کا دور کی بھی موضوعات ملتے ہیں اور اس دوران پیش آنے والے مصائب و مشکلات کا بیان اپنے سائنسی شعور کے تحت اس میں نت نئے موضوعات ہیں۔ الجزائر کے پس منظر میں بھی ایک نظم اس میں شامل مجموعہ ہے۔

سفینے اگر ڈوب بھی جائیں
موجوں کے پُر پیچ رستے سلامت رہیں گے (۲۵)

(ماورا، ص ۸۵۰)

ان کی شاعری میں کائنات، مورت، امید، وقت اور موت اور خدا کے بارے میں سوالات اٹھائے گئے اور ان کی نظموں میں حقیقت اور اصلیت نمایاں ہیں اور اپنی کمزوریوں پر نکتہ چینی خود ہی کرتے نظر آتے تھے۔ تانکہ اصلاح کے امکانات بڑھ سکے۔

اخلاقی قدروں کا درس دیتے نیکی، امن، حرکت و عمل، انقلاب اور سماجی مساوات جیسے عناصر پائے جاتے ہیں۔ جو کہ ان کی نظموں کا خاصا ہیں۔ اسی طرح شہزاد احمد کے ہاں انسانی زوال، اخلاقی قدروں کی پامالی کا حل انسانی جدوجہد

میں مضمر ہے اور شر پسندوں کو آئینہ دکھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جہاں پر موضوعات تنوع وہی پر اندازِ بیان خوبصورت۔ چند نظمیں جیسے بیٹھے ہوئے کہی کو چھوٹا سا خیال آیا ہو اور اس کو لفظی جامہ پہنا کر قاری کے سامنے پیش کر دیا ہو یوں معلوم ہوئیں ہے چند نظمیں۔ عام سے عام موضوع کو فکری دھارے میں پرو کر بیان کرنا اچنبھے کی بات ہے اور یوں محسوس ہو تا جیسے سب اپنی اپنی اہمیت کے لحاظ الگ الگ معلوم ہو تا۔

انسانی زندگی کی بنتی بگڑتی صورتیں اور جذبوں کا اتار چڑھاؤ شہزاد کی شاعری خاص کر نظم میں ڈھل جاتے ہیں۔ انسانی آشوب کو اپنی فکر کا حصہ بناتے ہیں اور یہ فکر شعری سانچوں میں ڈھل جاتی اور اس مجموعے میں شہزاد احمد کی آواز تشکیک میں گھیرے انسان کی لگتی ہے۔

> ''خالی آسمان کی وساطت سے ایک ایسے شاعر سے ہماری شناسائی اور گہری ہوتی ہے
> جس کا ایک فکری مزاج بھی ہے۔ جو نئی زندگی کی تبدیلیوں سے آشنا ہے اور جسے
> معاشرتی انصاف کی تمنا ہے۔''(۲۶)

اس مجموعے کی نظموں میں شہزاد احمد کبھی تو خود سے اور کبھی خدا سے سوال کرتے نظر آتے ہیں اور انسان جذبات و احساسات کا بیان اپنی فکر میں مدغم کرتے ہیں اور پھر شعری سانچے نظم کی صورت میں ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ سائنسی شعور کی بلندی و وسعت شہزاد احمد کے ہاں نمایاں دکھائی دیتی ہیں۔

''بکھر جانے کی رُت'' یہ مجموعہ ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں بائیس نظمیں شامل ہیں۔ جن میں سے ۱۴ مناسب ساخت کی اور آٹھ مختصر نظمیں ہیں۔ اس مجموعہ سے یوں لگتا ہے کہ یہ ہے تو غزلوں کا ہی مجموعہ مگر منہ کے ذائقے کو بدلنے کے لیے نظمیں بھی کہیں گئی۔ انتہائی سادہ الفاظ میں ہلکے پھلکے کھٹے میٹھے جذبوں پر مشتمل نظمیں ہیں۔ جو شاعر کی ذہنیت کی عکاسی ہے۔ مجموعے کے آخر میں شامل مختصر نظموں قطعات کی صورت میں ہے۔ اس لیے کہ یہ تین چار مصرعوں پر مشتمل مختصر کیفیات کا اظہار معلوم ہوتی اور اس کی نظمیں گذشتہ مجموعوں کی توسیع معلوم ہوتی۔

کہتے ہیں کہ حرکت میں برکت شہزاد احمد کی نظم چلو کہیں کا ارادہ کر لو اس کا آئینہ ہے۔ کہ یہ جو انسان زندہ ہے اور اس زندگی کا حصہ ہے دکھ سکھ کہ تم انسان ہو نہ کہ درخت جو ایک ہی جگہ کھڑے رہنے سے تمہاری سب مشکلیں دور ہو جائے گی بنا کچھ کہے۔

> چلو کہیں کا ارادہ کر لو
> کہاں تلک اس زمیں کے ٹکڑے پہ بت کی صورت کھڑے رہو گے

تم آدمی ہو شجر نہیں ہو؟
نہ تم میں موسم کے رنگ چھونے کا حوصلہ ہے
نہ تم میں بارش کو جذب کرنے کی تشنگی ہے
نہ تم نے مٹی سے زندگی کا لہو لیا ہے
نہ تم نے جلتی ہوا کو تسخیر ہی کیا ہے (۲۷)

(بکھر جانے کی رُت، ص ۱۰۰۳)

بعض نظموں میں یوں لگتا ہے پڑھتے ہوئے کہ جیسے شاعر کے ذہن میں نظم کا کوئی خاص تصور نہیں۔ مصرعے بنانے شروع کیے ایک منظر دکھا کر ادھوری بات کر کے نظم کو ختم کر دیا ہو۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے شہزاد احمد کے ہاں اس مجموعے کی نظموں میں بس اظہار کے نمونے ملتے ہیں۔ نہ کہ ایک کل کے طور پر نظم۔ کبھی خود تو کبھی ہوا سے باتیں کرتے دکھائی دیتے۔ تو کبھی انسان ضروریات وخواہشات کا بیان تو جیسے کچھ لکھنے کا خیال آئے یا کوئی خیال در آئے اور اس فکر کو شعری انداز میں بیان کرنے کا نمونہ محسوس ہوتا ہے۔ کہیں ایک ننھی لڑکی شرارتیں ان سب کا شعری بیان اس مجموعے کی نظموں کا خاصا ہیں۔ ”آنکھ مچولی“

وہ اک ننھی سی لڑکی
برف کے گالے سے نازک تر
ہوا میں جھولتی شاخوں کی خوشبو
اس کا لہجہ تھا
چمکتے پانیوں جیسی سبک رو
اس کی باتیں تھیں
وہ اڑتی تتلیوں کے رنگ پہنے
جب مجھے تکتی (۲۸)

(آنکھ مچولی، ص ۱۰۲۷)

شاعر نے انتہائی مہارت سے انسانوں کو درختوں کی مانند قرار دیتے کہتے ہیں۔ انتہائی دلچسپ انداز میں فکری زاویے کو شعری بیان میں ڈھلنے کی کوشش کی ہے۔ انسان جو جوانی سے بڑھاپے تک اور اس سب میں در پیش آئے تمام

حالات وواقعات، جذبات واحساسات کا بیان دلچسپ پیرائے میں پیش کیا ہے سب کو۔ اور پھر کیسے وہ سب آب و تاب بعد میں عمر اور وقت کے ساتھ مدھم پڑ جاتی ہیں اور شاعری یوں لگتا ہے کہ محبوبہ سے پہلی ملاقات سے لے کر انجام تک کی کہانی بیان کر رہا ہو۔ اس کی مثال نظم "پیڑ بوڑھے ہوئے" ہے اور چند نظمیں تو عام سے خیال، فکر کو شعری انداز میں بیان کرنے کی مشق کی گئی ہو جیسے مثلاً "تین روپ"، "ہم اور ہوا"، "بستا اجڑ تا ایک دن"، "پہلی جہت" وغیرہ۔

اس شعری مجموعے میں قطعات یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے محبوبہ کی تعریف اور اس سے ملاقات کا بیان ہو۔ کبھی زندگی کی بے ثباتی، اس کے حسن قد و قامت سب کا بیان نظر آتا ہے۔

ہماری زندگی میں جس کی خوشبو سے مہکتے دن
ذرا سی بات پر ناراض کر لیں اس کو، ناممکن
محبت اس سے بھی ہے، جھوٹ سے نفرت بھی ہے لیکن
اگر سچ بول دیں تو بات آگے چل نہیں سکتی (۲۹)

(قطعہ، ص ۱۰۴۰)

جہاں متنوع موضوعات ملتے ہے وہی پر ان کا شعری لب ولہجہ اور لفظوں کا چناؤ دلچسپ زاویے سے کیا گیا ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے عام سے تصور کو شعری پیرائے میں مجسم کیا گیا۔

انگلیاں جلتی ہیں جس پھول کو چھونے کے لیے
پاس پہنچوں تو مجھے ہاتھ لگانے ہی نہ دے
یہ بھی ممکن ہے اگر لوٹ کے جانا چاہوں
وہ مرا رستہ روکے مجھے جانے ہی نہ دے (۳۰)

(قطعہ، ص ۱۰۴۲)

محبت کا وہ ایک لمحہ، اس لمحے کی کسک اور نبھانے کا انداز، اظہار سب کا چاشنی بھرے لہجے میں بیان کرنا اور نت نئے لفظوں کو یکجا کرنا اور محبت کے لیے لمحہ کافی تو کہیں پوری عمر درکار ہو جاتی ہے۔ ان کا شاعرانہ بیان ان تمام قطعات کا موضوع سخن ہے۔

اس لیے میں نے تجھ سے محبت نہ کی
زندگی چاہیے اس عمل کے لیے
آج کا دن تو جوں توں گزر ہی گیا
کچھ بچایا نہیں میں نے کل کے لیے[۳۱]

(قطعہ، ص ۱۰۴۱)

ایسا لگتا ہے جیسے شاعر کو محبت میں کبھی ایک لمحہ تو کبھی عرصہ دراز چاہیے۔ یہ جذبہ تو حسن لطافت سے بھرپور ہوتا ہے اور اس کو موضوع سخن بنانا اور بھی دلفریب ہے۔ یہ مجموعہ کی نظمیں ان کے موضوعات و قطعات اپنی ایک الگ پہچان و انداز اپنائے ہوئے۔ جس سے شاعر کے تخلیقی و فکری سوچ کا پیرایہ کس لطافت کا عکاس ہے۔

تیز بہت تھی روشنی، ویسے تو بزمِ ناز میں
میں نے جلا کے رکھ دیا، ایک چراغ اور بھی[۳۲]

''ایک چراغ اور بھی'' شہزاد احمد کا شعری مجموعہ ہے جو کہ مارچ ۲۰۰۴ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے کی نظمیں تعداد کے لحاظ سے مختصر ہیں۔ تقریباً چھ عدد نظمیں اس مجموعے میں اپنی جگہ بنا پائی اور یہ نظمیں خالص نظمیں ہیں۔ یوں نہیں لگتا جیسا پہلے مجموعے تھا کہ بس جو تصور، خیال آیا اس کو شعری جامہ پہنا کر بیان کر دیا۔ اس میں شہزاد احمد خالص نظم گو شاعر کے طور پر ابھرتے نظر آتے ہیں اور نظمیں موضوع میں تنوع ہمیشہ کی طرح وہی ایک بات ایک ہی خیال بار بار پیش نہیں گیا۔ اس میں رومانوی انداز کی نظمیں ہیں اور چند جو ہیں کچھ کائنات میں موجود بلند و بالا وسعت کے حامل خلا کا سفر تو کہیں پر آسمان سے آگے کی جستجو کہیں پر زمین کی تہہ در تہہ کھوج، مضبوط خیال کا بیان۔ یہ سب اس مجموعے کی نظموں کے موضوعات و فکر کا دائرہ کار ہے۔ کبھی لگتا محبوبہ سے محبت کی بات ہو۔ پھر ایک دم سے خالق حقیقی کی تخلیقات کی طرف رجحان بڑھ جاتا۔ دونوں کا ملاپ یہ اس مجموعہ کی نظموں میں پایا جاتا ہے۔

خاک سے ہی عقیدت رہی اور اسی میں جانے کی فکر یہ نہ ہم سے ہو سکا کہ فلک سے آگے بھی کچھ ہے۔ اس کو نظر انداز کیے بیٹھے ہے۔

جو روشنی کی تیز رو ہیں
سو ہم خاک کے ساتھ چمٹے رہے
پھر بھی اس کو نظر بھر کے دیکھا نہیں

ہم نے سوچا نہیں
آسماں کی سرکتی ہوئی سیڑھیاں
کس طرف جا رہی ہیں
ہمیں خاک ہی سے عقیدت رہی
اس کے دل میں اترنے کی خواہش رہی [۳۳]

(اُسے ہم نے دیکھا، ص ۱۸۰)

خیال کو شعر کے سانچوں بلکہ نظم کے سانچوں میں جس مہارت سے بیان کیا گیا ہے کیسے کبھی کبھی ایک لمحے میں کیا سے کیا ہو جاتا۔ لمحے کی اہمیت اور اس میں محسوس ہونے والے جذبات ان کی اہمیت اور اس لمحے کی مکمل کہانی کو موضوع سخن بناتا نظر آتا ہے شاعر جس فکر مہارت کے ساتھ۔

اور تم کون ہو، جو انہیں جان لو
تم تو میری طرح آرزومند ہو
چاہتے ہو چلیں، آسمان کی طرف
جس طرف کوئی رستہ نہیں
کوئی منزل نہیں
کب تلک اس سفر کی تمنا کریں
اب چلو آسمان کی طرف چل پڑیں [۳۴]

(آسمان کی طرف، ص ۱۸۹)

کائنات میں انسان کے مقام و مرتبے میں کمی، کائنات کی بے پناہ وسعت کے تصورات اور خلائی سائنس و فزکس کی ترقی کی بدولت نہیں آتی بلکہ سرمایہ داری بربریت کے نتیجے میں آئی ہے۔ جس نے اعلیٰ انسانی قدر رو کو ملیامیٹ کر دیا۔ جس کی وجہ سے انسان کا مقام خدا کے بعد اس دنیا میں سب سے بلند تھا۔ سرمایہ داری نظام نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے خود خدا کے وجود کو معرضِ سوال بنا کر رکھ دیا ہے۔ اب تو یوں لگتا ہے کہ خدا اور انسان مارکیٹ میں بڑھتے گھٹتے ریٹ کی مانند ہے۔ تو یہ ہی حال انسانی اقدار اور انسانیت کا ہے۔ ایک مشین بنا کر رکھ دیا ہے اور نہ اب وہ

انسانیت والی صفات باقی رہی نہ ہی انسان کی کوئی اہمیت۔ آدمی جو نہ تو خدا تک پہنچ سکا نہ کائنات سے ہم آہنگ ہو پایا ہے۔ لٰہذا یہ اپنی پہچان سے بھی محروم ہو گیا ہو جیسے

شہزاد احمد کے ہر مجموعے میں محبت کی چاشنی بھی ملتی ہے۔ یہ موضوع ہر مجموعہ میں پایا جاتا ہے۔ شہزاد احمد نفسیات کے ماہر تھے۔ ان کی فکر اور نفسیاتی مراحل سے ہوتے ہوتے شاعری نظم نماروپ میں ڈھل گیا اور قاری کو پڑھ کر کسی فلسفیانہ فکر کا احساس ہوتا ہے۔ یہ کائنات اور اس میں پیدا کی گئی سبھی طرح طرح کی نعمتیں انسان شکر کی بجائے اور زیادہ کی تلاش میں سرگرم عمل ہے۔ موجود کی قدر و قیمت نہیں۔

شہزاد احمد کے تخلیقی ذہن کی تشکیل میں ان کے نفسیات اور فلسفے کے مطالعہ نے اہم کردار ادا کیا۔ فکری سطح پر شہزاد احمد کے ہاں اگرچہ پرانے موضوعات بھی کثرت سے موجود ہیں۔ مگر انہوں نے موضوعات کو نئے قالب میں ڈھالنے کا بھی جتن کیا۔ شہزاد احمد کسی ایک موضوع یا مسئلے پر مرتکز نہیں بلکہ وہ بہت سارے اسرار و رموز کی کھوج میں سرگرم عمل رہتے ہیں۔ مرتے دم تک جمود کا شکار نہیں رہے۔ البتہ فکر کے حوالے سے بہت زیادہ تر و تازہ رہے۔ شہزاد احمد کی نظمیں اور غزلیں ساتھ ساتھ سفر کرتی دکھائی دیتی۔ دونوں پر ایک دوسرے اثرات نظر آتے ہیں۔

شہزاد احمد جذباتی شاعر ہونے کی بجائے وہ عقلی شاعر زیادہ ہے۔ جذبات میں سے کہیں نہ کہیں عقل کے زاویے کو تلاش کر لیے ہے۔ عقل ان کے ہاں اہم ہے۔ جذبات بھی ہے مگر مطالعہ سے یوں لگتا کہ ہر نظم پہلے جذبات کی ترجمانی کرتی اور پھر بعد میں عقل کا عنصر آجاتا ہے۔ اور ان کی فکر پر بھی جس چیز کا زیادہ اثر نظر آتا ہے وہ تعقل پسندی ہے۔ مجموعی طور پر جذبات کے شاعر نہیں عقل کے شاعر ہیں۔ جذبات کی رو میں نہیں بہتے بلکہ چلتے چلتے کوئی نہ کوئی عقلی توجیہ پیش کر دیتے۔ شاید اس لیے کہ ان کی تعلیمات میں فلسفہ اور نفسیات شامل ہے۔ آپ نے ان کا مطالعہ بڑی عرق ریزی کیا ہوا تھا۔

شہزاد احمد کے ہاں موضوعات متنوع رنگ اوڑھے نظر آتے ہیں۔ ہر موضوع اپنے آپ میں ایک کل کی مانند اور کچھ نظمیں تو عام سے تاثر کو انتہائی سلیس انداز میں بیان کیا گیا۔

> ”شہزاد احمد کی نظم نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے جو چیز ہمیں سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ ان کا موضوعاتی تنوع ہے۔ ان کی نظمیں ذات سے لے کر کائنات تک مختلف اور متنوع مضامین اور افکار پر پھیلی ہوئی ہیں۔ ان میں ذاتی تجربے بھی ہیں، نفسیاتی حوالے بھی ہیں، علاقائی اور سماجی حوالے سے بھی بہت سی وارداتوں کا

اظہار ہوا ہے۔ اور کچھ نظمیں گلوبل حوالے سے بھی اپنی معنویت آشکار کرتی نظر آتی ہیں۔ انہوں نے اپنی نظموں میں مختلف زمانوں کو آمیز کیا ہے۔ ان کا تخلیقی شعور ماضی، حال اور مستقبل کو ایک ہی نظر سے دیکھتا ہے۔۔۔۔
ہماری شاعری کے لیے یہ موضوعات ایک نئے ذائقے کے مترادف ہے۔ شاعری ویسے تو ہمیشہ ہی سے معلوم سے نامعلوم اور شے سے لاشے کی طرف سفر کرتی ہوئی نظر آتی ہے لیکن شہزاد احمد کی نظموں میں ایک ایسے جہان معانی کو متعارف کرانے کی کوشش کی گئی ہے جو کہ ''معلوم سے آگے'' کا جہان ہے۔''(۳۵)

شہزاد احمد جہاں معنی کی تلاش میں مدغن نظر آتے وہی پر اس کی تفہیم پر بھی اتنا ہی توجہ دی۔ جہاں پر جذبات سے کام لیتے نظر آتے وہی پر اسی میں سے عقل کے پہلو بھی تراش لاتے۔ عقل شہزاد احمد کے ہاں منبع ہے ان کی نظموں میں۔ جذبات سے کام لیتے ہوئے عقل کے عناصر کو مد نظر رکھتے ہے اور جذبات میں سے ہی عقل کے پہلوؤں کو نت نئے رنگ ڈھنگ میں بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کا یہ مجموعہ منفرد اور اپنی ایک الگ پہچان بنائے ہوئے۔

نظمیں کم ہونے کے باوجود اپنی ایک منفرد جگہ بنائے ہوئے ہیں اور اس میں مختلف زاویوں سے جذباتی نہیں عقلی پہلوؤں کا بیان ہے اور سوچ کا محور عقل ہی ٹھہرتی ہے اس مجموعہ میں۔ شہزاد احمد کے ہاں موضوعات ایک سے نہیں بلکہ ایک سے بڑھ کر ایک ہے۔ جو کہ اپنے آپ میں ایک کل کی مانند ہے اور اس فکر کا مکمل احاطہ کیے ہوئے دکھائی دیتے۔

دنیا کی ترقی نے انسانی اقدار کو جو ٹھیس پہنچائی وہ دکھ کا باعث ہے۔ انسانی قدروں میں مٹی میں ملا کر انسانوں کو ایک مشین کا مانند بنا دیے۔ ''ایک چراغ اور بھی'' میں شاعر کی محکمہ کا دھارا متنوع لب ولہجے اپنائے ہوئے نظر آتا ہے۔

''آنے والا کل'' شہزاد احمد شعری مجموعہ جو کہ ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں غزلوں کی تعداد کثیر ہونے کے باوجود نظمیں کم ہونے کے بعد بھی دونوں کا موضوع ایک ہے۔ شہزاد احمد کے بارے میں ایک فقرہ مدت سے چلا آرہا ہے کہ

''ان کی شاعری تلاش معنی کی روداد ہے۔''(۳۶)

غالب نے اپنے کسی شاگرد کو لکھا تھا کہ ''شاعر معنی آفرینی کا نام ہے۔'' شہزاد احمد کا یہ مجموعہ اسی اضافے کا آئینہ دار ہے۔ اس مجموعے میں شہزاد احمد نے ایک معنوی کل بنایا ہوا۔ جو پچھلے مجموعوں۔ مگر اختلاف یہاں ساخت کا ہے۔

جاگو!
مگر اب جاگنے کا وقت شاید جا چکا ہے
وہ زمانہ آچکا ہے
جس کی خواہش کرتے کرتے
تم زمین میں دھنس گئے ہو
اپنے اندر پھنس گئے ہو(۳۷)

(ٹوٹتے بنتے ہوئے، ص ۱۰)

اس کی خاص بات یہ ہے کہ اس مجموعے میں شاعر حسیات اور ذہن کو ایک دوسرے کا بدل بنانے کا جو تجربہ کیا ہے۔ ایک حد تک نظموں میں الفاظ کی لفظیت کو ابھرنے کا موقع نہیں ملا۔ ان کے کردار معانی کی واقعاتی تشکیل تک محدود ہے۔ معنی تصور کی قید سے نکال کر جس غیر ذہنی صورت بلکہ عمل میں ڈھل جاتا ہے۔ لفظ اسے تجربہ کے لائق بنا دیتا ہے۔

''معنی کی بصری تشکیل اور احساسات کی ذہنی بناوٹ جو جدید فزکس اور نفسیات کے ساتھ شہزاد احمد کے تخلیقی تعلق کا نتیجہ ہے اور ان کی کل شاعری کا خاصہ ہے۔''(۳۸)

اس تجربے کے بعد نتیجے یہی نکلے گا کہ معنی، محسوس تو ہو جاتے ہیں مفہوم کی سطح تک اتر کے متعین نہیں ہوتے اور یہی چیز نظموں میں پائی جاتی ہے۔ اور ویسے بھی حقیقت ہر تصور میں جمالیاتی شعور کی مانند ہے نہ کہ عقل۔

اس مجموعے میں شہزاد احمد کی معنی پذیری کی وسعت متنوع موضوعات اپنائے نظر آتی ہے نظموں کی صورت میں۔ اس میں شاعر نے نہایت فلسفیانہ و نفسیاتی دونوں کے ملاپ کی کوشش کی۔ جس کو پڑھ کر ذہن معنی اور شے دونوں میں جکڑ کر رہ جاتا ہے۔

اس مجموعے کی نظمیں کشمکش میں ڈالنے والی اور معنی اور شے کے تصور کو سمجھنے کی ساعی کی ہے۔ آنے والا کل کی نظموں کے بارے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ

"ان میں معنی، کرافٹ اور معنویت دونوں پر غالب ہے۔"[۳۹]

یہاں پر معنویت کا تعلق یہ ہے کہ معنی کا وہ تصور جو ذہن کا ایجادہ کردہ ہے۔ جس کے تحت ذہن، شے پر تسلط جمائے رکھتا ہے اور اس مجموعے کی نظموں میں زیادہ زور اسی عنصر پر ہے کہ معنی اور ذہن کا تلازم توڑ کر معنی اور شے کی اصلی نسبت بحال کی جائے۔

بے شمار احباب، ہر لمحہ نئے نئے چہروں کے ساتھ
مجھ کو ملتے ہیں
مجھے کہتے ہیں پہچانو ہمیں
میں انہیں پہچان لیتا ہوں
مگر اس کھیل میں
بھول جاتا ہوں کہ میں خود کون ہوں[۴۰]

(کس قدر تنہا ہے، ص ۱۶)

ان نظموں کے مجموعے میں چند نظموں کا مطالعہ کرنے کے بعد اسی کشمکش میں قاری رہ جاتا کہ معانی اور شے کی اصل نسبت کیا۔

کیا میں ایسی زمیں پر کھڑا ہوں
جسے دیکھنے کے لیے
مجھ کو آنکھیں نہیں چاہیں۔۔۔[۴۱]

(اس گمان کی طرف، ص ۱۶)

ایک چپ تھی کہ جو چلائے چلی جاتی تھی
میری ہی چاپ کو دہرائے چلی جاتی تھی
میں تھکا ہارا مسافر تھا
کسی سایے کی حاجت تھی مجھے

شاید اپنی ہی ضرورت تھی مجھے [۴۲]

(اپنی دہلیز پر، ص۱۷)

یہ اقتباسات ان نظموں سے لیے جو کہ دیکھنے میں عام سے مگر ان کا مطالعہ کر کے نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس مجموعے کی ہر نظم اپنے آپ میں ایک کل کی مانند ہے۔ کچھ نظمیں تو نہایت عمدہ اور وسعت خیالی کا نمونہ معلوم ہوتی ہیں اور ان اقتباسات کو غور سے دیکھیے تو تینوں میں نفسیاتی، کائناتی تناظر بنایا گیا ہے۔ جو کہ آدمی بلکہ عام آدمی پر مرکوز ہے۔ فکر کا بیان عمدہ، کبھی اتار چڑھاؤ تو زندگی کا حصہ ہے۔

اس میں چار نظمیں انتہائی اہم ہیں۔ مثلاً ''میں کہاں ہوں''، ''بند مٹھی''، ''ہم تم سے کیوں ملتے'' اور ''میں سے میں تک'' یہ ایک مجموعے کی بہترین نظمیں ہے۔

میاں کہاں ہوں بناوٹ میں سادہ اور پیچیدہ نظم ہے۔ اول و آخر میں بیان کی دونوں میں یکسانیت ملتی ہے۔ بالکل ایسے کہ جیسے دائرہ ایک نقطے سے شروع ہو تا اسی پر تمام ہو جائے۔ لیکن کیا دائرہ کا نقطہ آغاز، اختتام ایک ہی چیز ہے اور یہی نظم کہتی ہاں اور نہیں بھی۔ شہزاد احمد نے ہاں اور نہیں کو ایک دوسرے میں کیسے ضم کیا۔

میں کہاں ہوں
یہاں کچھ نہیں
صرف ہونے کا احساس ہے [۴۳]

(ایضاً، ص۱۷)

کہیں ہونے / موجودگی کا احساس تو کبھی یہ نظم مختلف محسوسات اور میں کے لحاظ و استعمال سے نئے نئے مفاہیم نظر آتے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے معلوم اور نہ معلوم کے درمیان کی کشمکش کا بیان ہو۔ یہ میں نظم میں کئی روپ لیے ہوئے کبھی ہونے کا تو کبھی نہ ہونے کا احساس کی روداد معلوم ہوتی ہے۔

جود اور موجود کی دوئی کا تصور تخیل کا وہ منتہیٰ ہے اس نظم کا محور آدمی ہے اور آدمی جو کہ ابھی ٹھیک طرح سے بیان نہیں ہوا۔

بس جہاں ہے، وہیں ہے
مگر سرد و ساکت نہیں ہے
اک حرارت ہے جس میں سکونت کا پھیلاؤ ہے [۴۴]

(میں کہاہوں، ص۱۷۹)

شہزاد احمد نے فزکس کے اثرات کو مابعد الطبیعی کیفیت اور معنویت کے ساتھ قبول کیا۔ یہ نظم اس کی مثال ہے کہ خیال اور احساس کی جو سطحیں مابعد الطبیعاتی امور کے لیے وقف ہے ان پر بھی فزکس کی گرفت قائم کر دی گئی۔

"اس نظم میں انسان کی روحانی یا نفسیاتی گہرائیوں کو بھی فزکس کی مدد سے کھنگارا گیا ہے۔"(۴۵)

اس میں شاعر نے فکرانہ انداز میں انسانی جذبات و احساسات کو فزکس پس منظر کے طور پر دیکھا۔

نظم "میں سے میں تک" کا بھی یہی موضوع ہے۔ اس کتاب کی سب سے لمبی نظم ہے۔ نظم "میں کیا ہوں" کا "میں" نقطے کی مانند ہے اور اس نظم میں آکر دائرہ بن چکا ہے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ وہاں دائرہ سمٹ کر نقطہ بن گیا تو اب یہاں نقطہ پھیل کر دائرہ اور اسی وجہ سے نظم میں "میں" کا انسانی پن زیادہ واضح نظر آتا ہے۔

میرے مسئلے وہ نہیں ہیں
جو تم سوچتے ہو
نہ وہ جو تم چاہتے ہو
میں اپنی طرح کا اکیلا ہی انسان ہوں(۴۶)

(میں سے میں تک، ص۱۷۹)

اس نظم میں یوں محسوس ہوتا کہ معنی اور اخلاق کو پیچیدہ تناظر میں مربوط کیا گیا۔ انسان کے اخلاقی وجود کی موت کس طرح اسے خود کی حقیقت و معنی سے محروم کر رکھا ہے۔ نظم "میں سے میں تک" اسی المیہ کی روداد ہے۔ جس میں انسان خود کی حقیقت سے ناآشنا ہے۔ اور "میں" میں مگن ہے۔ وہ "میں" انا، غرور وغیرہ کی بھی ہو سکتی ہے۔ انسان "میں" سے نکلے گا تو عود سے آشنا ہو پائے گا اور اکیلا ہو کر رہ جاتا ہے انسان۔ اکیلا مطلب تنہا، یکتا اور آخری۔ شہزاد احمد نے ایک لفظ میں اتنے معنی بھر دیے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے کہ فہم و محسوسات کے اندر نئی لچک پیدا ہو رہی ہے۔ اسی وجہ سے دنیا اس کی ہستی کا ماحول نہیں بن پائی۔ شاید اس لیے کہ محسوسات ہوتا ہے کہ اس کی حرکت، وقت کی رفتار سے مختلف ہے۔

میں زمانے کے ہمراہ چلنے کی کوشش بھی کرنے سے معذور ہوں
تم سمجھتے ہو مغرور ہوں

ذلت کے بندی خانے میں محصور ہوں[۴۷]

(میں سے میں تک، ص ۱۹۳)

اس نظم میں (تم) دنیاوی آدمی کی پوری نوع کا عنوان ہے۔ میں اور تم کے مل جانے سے دونوں یکسانیت کے بعد دنیا اپنی داخلیت سمیت سامنے آجاتی ہے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ دنیا اور آدمی ایک دوسرے میں مدغم ہونے کے عمل سے گزر رہے جس وجہ سے اس منظر کی بناوٹ انسانی عنصر نمایاں ہے۔ ایک بے نام سی بے حسی ہو جیسے

کوئی آہٹ کسی ایسے جنگل سے آتی ہے

جس میں درندے درختوں سے لپٹے ہوئے رو رہے ہیں

کہیں مر گئے ہیں کہ دربان ابھی سو رہے ہیں

یہاں کس لیے رات دن حادثے ہو رہے ہیں[۴۸]

(میں سے میں تک، ص ۱۹۴)

شاعر نے اس نظم میں ایک ہی موضوع نہیں متنوع موضوعات بیان کر دیے ہیں اور اپنی مہارت سے ان سب کا بیان اپنی مثال آپ ہے۔

"یہ عالم خود کچھ نہیں۔ تقدیر کے آئینے پر بنتا بگڑتا عکس معلوم ہوتا ہے اور اس جنگل کا عکس جہاں پر ہمیشہ مستقبل کا موسم رہتا۔ جس کل کو ابھی آتا ہے وہ وہاں کا آج ہے۔ ہم یہاں جو بننے والے، وہاں بن چکے۔ جن واقعات سے ہم آئندہ گزریں گے، وہ ادھر ہو چکے ہیں۔"[۴۹]

یہ سب کے سب عناصر اس کتاب کے نام کی معنویت ہے۔ انسان نے آج میں جینا چھوڑ دیا۔ حاصل کی قدر نہیں۔ جو ابھی آیا نہیں ملا نہیں اس کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ اسی لیے ہمیشہ بے حسی و مایوسی کا شکار نظر آتا ہے اور جسے ہم دنیا سمجھ رہے ہیں۔ وہ ایک نقلی جنگل ہے اور انسان یہاں کا نقلی درندہ ہے۔ جو زندگی کے آداب سے بھی عاری نظر آتا ہے۔

یہ انسان کیا درندہ ہے

اپنی ہی گردن میں خود دانت گاڑھے ہوئے ہے

اور اپنی ہی صورت بگاڑے ہوئے ہے[۵۰]

(ایضاً، ص ۱۹۴)

اور انسان ایسے ماحول کا عادی یہاں خود شناسی کے سبھی دروازے بند ملتے ہیں۔ خود کو محسوس تو کرتا مگر اپنی انا کے ہاتھوں اور حدوں میں اس قدر ٹوٹ پھوٹ چکا ہے کہ اپنی پہچان کا کوئی بھی ذریعہ باقی نہیں چھوڑا/رہا۔ دنیا اس نے آدمی کو قبر کی مانند دبائے رکھا ہو جیسے ایسے معلوم ہوتا ہے اور کوئی زندہ انسان کی پہنچ وہاں تک ممکن ہی نہیں لگتی جیسے اور اس میں وہ ناپائیداری کا شکار ہے۔

یہاں دور تک آئینہ بھی نہیں
جس میں، میں اپنی صورت کو پہچاننے کی تمنا کروں
جس کے اندر اتر کر
میں اس شہر تک آن پہنچوں
جہاں تم مکیں ہو!(۵۱)

(ایضاً، ص ۱۹۴)

دنیا تو یوں لگتا کہ بس (تم) کے لیے سازگار ہے اور (میں) کو اپنے اندر اترنے نہیں دیتی۔ ”میں“ ناقابل شناخت تو ہے ہی مگر اس کی شدید خواہش ہے اور (تم) کو جس میں دوسروں کے ساتھ خود وہ بھی شامل ہے فنا کرنے کے درپے رہتا۔ یعنی سمجھ لیجیے کہ تخریب اور خودکشی کا ایک ریلا اس کے اندر چل رہا ہو اور کچھ نہ سمجھ آرہا ہو۔ بس وہ ریلا کچھ اندر سموئے جارہا کچھ باہر نکالے بہے جارہے اور جہاں سے اس نظم کا رخ مسلمانوں کی طرف ہو چکا ہے۔ اس مجموعے کی سب سے منفرد اور اہم نظم یہ ہے۔ ”میں سے میں تک“ دیکھنے میں عام فہم معلوم ہوتی ہے مگر اس میں سمجھ لیجیے کہ آغاز سے انجام تک تمام موضوعات کی کارفرمائی ملتی ہے۔ اور وہ آغاز کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ کسی بھی جذبات و احساسات کا، کسی بھی چیز کا ان سب کا نہایت عمدگی سے اور سلیس انداز میں اس مجموعے کی اس نظم میں شامل بیان ہے۔ اور اس سب میں وہ خود کی بھی سمجھ سے عاری نظر آتا ہے۔

عجب بات ہے
تم جو زندہ نظر آرہے ہو
مگر چند صدیوں سے زندہ نہیں ہو
مدتوں میں کہیں جاگتے ہو

اور اپنا لہو چاٹنے کے لیے

دم ہلاتے ہوئے ہر طرف بھاگتے ہو[۵۲]

(ایضاً، ص ۱۹۵)

اپنی ناپائیداری اور اخلاقی قدروں سے دوری خود سے ناآشنائی میں اتنی آگے نکل چکے ہو کہ واپسی کا راہ نظر آنا ناممکن لگتا نظر آتا ہے اور دنیا جو کہ ایک نقلی جنگل اور انسان جو کہ اس نقلی جنگل کا نقلی درندہ صدیوں گزر چکی پیدا ہوئے دونوں کو۔ مگر خود کی اصلیت کا وصف کو حاصل کرنے پہچاننے کے لیے دنیا خود کو ویران کرنا سیکھ رہی ہے اور انسان اپنی ہی گردن میں دانت گاڑ کر اپنا ہی لہو چاٹ کر درندگی کی مشق کر رہا ہے۔

امت مسلمہ صدیوں گزر چکی مردہ بڑی ویسی کی ویسی۔ اگر مدتوں میں کہیں کوئی ہل چل پیدا ہوتی ہے تو بالکل اس مردے کی بیداری کی مانند جو موت کو پہلے سے زیادہ مکمل کر دیتی، چکی ہے۔ اب اس مردے کو بیداری سے کیا سروکار۔ عرصہ دراز ہو چکا پیدا ہوئے مگر اپنی انا اور خودکشی میں اتنا آگے گزرتا جارہا کہ اس کو خود اور نہ اس دنیا کی کوئی خبر ہے۔

مگر تم کو اتنا تو معلوم ہے

تم یہاں پر اکیلے ہو

تخریب کی زرد خواہش تمہیں مرنے دیتی نہیں

زخم رکھتی ہے ہر دم ہرے

بھرنے دیتی نہیں

اک چبھن ہے

جو آرام کرتی نہیں، کرنے دیتی نہیں[۵۳]

(ایضاً، ص ۱۹۵)

یہ بند شاعر نے مسلم حکومتوں سے ہوتے القاعدہ جیسی تنظیموں کی طرف کر دیا گیا ہے جو کہ خودکشی کرنے میں اتنے آگے نکلتے جارہے ہیں۔ ایسی راہ ممکن ہے بھی کہ نہیں کوئی سروکار ہی نہیں۔ خود کی انا، تنہائی میں تو ذرا گہرائی اور طمانیت ہوتی ہے۔ مگر پوری نوع اکیلی رہ جائے گی اس میں اور اس سے زیادہ ڈراونے پن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ساری دنیا یوں محسوس ہو رہا ہے خود اپنے لیے ادراک اور اظہار کی سطح پر (تم) بن گئی۔ اس کا اکیلا پن تاریخ ہستی کا سب

سے بھیانک واقعہ معلوم ہوتی ہے اور نہ دنیا اور نہ ہی انسانوں کو اس کا احساس ہو رہا ہے۔ سب خود دانت خود کی گردنوں میں گاڑے اور الزام دوسروں پر درنے میں لگے۔

لہٰذا اس نظم کی ابتداء سے جس منظر کا آغاز ہوا تھا وہ اس بند میں آکر تکمیل کو پہنچتا معلوم ہو رہا۔ بس ایسے لگتا ہے جیسے کہ آگاہی کا ایک جھماکا ہے اور تجربے کی ایک باڑ۔ جو ذہن کو چندھیا دیتا اور محسوسات کی حدود کو پھلانگ جاتی ہے۔

خودی کے در وبست سے نکل کر آدمی بے انائی کے جس خلا میں مبتلا ہے وہاں پر تنہائی، موت اور انتشار وجودی ضروریات بن گئے اور جس کا انسان کو کوئی قیاس تک نہیں۔

اب اس نظم کا دوسرا آغاز ہوتا معلوم ہو رہا۔ یعنی حال کے تناظر سے اٹھ کر ماضی کے چھپے ہوئے سرے کو پکڑا گیا ہے اور جہاں پر (میں) اور (تم) کے امتیاز کے بغیر ایک تھے۔

کیا خطا تھی ہماری!
ہمیں جنتوں سے نکالا گیا
اور جنگل میں بن باسیوں کی طرح ہم کو پالا گیا
دل میں تخریب کرنے کی خواہش کو ڈالا گیا(۵۴)

(ایضاً، ص ۶۔۱۹۵)

شاعر بیان کرنا چاہ رہا ہے کہ ہماری اصلی خطا یہ تھی کہ ہم نے خودی کو جبلی بنا کر اسے اندر سے دولخت کر دیا۔ جنت میں ذات اور ہستی کا جو پیڑ بنا ہوا تھا یہ دولختی اس سے متصادم تھی۔ اس میں عنصر کار فرما تھے۔ ایک جنس تو دوسرا محبت۔ اس میں بھی (میں) کی کار فرمائی۔ اور نافرمانی اور اپنی انا کے ہاتھوں یہ سب کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ سب شہزاد احمد کا ہی ہے کہ وہ عام سے عام لفظوں سے بھی معنویت کے نئے نئے مطالب اخذ کر لیتے بنا کسی ترمیم کے۔ یہاں سے نظم میں نیا موڑ آتا ہے اور نظم اپنے موضوع کی شدت پر مرتکز نظر آتی ہے۔

'میں' سے 'میں' تک بہت فاصلہ ہے
اگر جاننے کی تمنا بھی ہو
تو یہ ممکن نہیں ہے
کہ ہم اس مسافت کو کم کر سکیں

’میں‘ سے ’میں‘ کو بہم کر سکیں (۵۵)

(میں سے میں تک، ص۱۹۸)

”میں“ سے ”میں“ تک کا یہ فاصلہ خودی کی خلا میں ہے۔ اس فاصلے کو جانا جا سکتا شاید ناپا بھی جا سکتا ہے مگر سمیٹا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ خلا میں فاصلہ ہی حقیقی ہے۔ یہ ختم نہیں ہو سکتا اور انسان اپنی انا میں دولخت ہو کر رہ جاتا ہے کہ اسے اپنی خودی اور وجود کی نفی تک پہنچ جاتا ہے اور ان سب میں ”میں“ کی کار فرمائی کا نتیجہ ہے۔

لہٰذا شعور کی کل پونجی بھی یہی ”میں“ ہے جو ایک خالی لفظ کی طرح ہے مگر جسے کسی بھی معنی سے بھرا جا سکتا ہے۔

اس جہاں سے مراد یہ دنیا ہے اور شعور کسی چیز کا ہونا دوسرے کی تصدیق بلکہ وجود پر منحصر ہے۔

اس جہاں میں موجود ہونے کا دعویٰ کرے

اس کو اتنا تو معلوم ہو

کون اس کی صدا سن رہا (۵۶)

(ایضاً، ص۱۹۸)

اور اس میں شاعر یہی بیان کر رہا وہ دوسرا ضروری نہیں خارج میں پایا جائے۔ خود اپنے اندر میں بھی موجود ہو سکتا ہے۔

اور اگر یہ حقیقت ہے

تو پھر سمجھ کو چہرے کی حاجت ہی کیا ہے!

کسی آئینے کی ضرورت ہی کیا ہے

میں ہوتے ہوئے بھی نہیں ہوں

اور نہ ہوتے ہوئے بھی یہیں ہوں

یہیں کا مکین ہوں! (۵۷)

شاعر نے جو بیان کرنے کی کوشش کی وہ یہ کہ اگر وجود، موجود اور عدم، معذوم نہیں ہے یعنی کہ وجود معدوم ہے اور عدم، موجود تو کم از کم تین چیزیں غیر ضروری ہیں۔ انا، کائنات اور شعور۔

لہٰذا ادراک اور اظہار ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ انسان جو اپنی بنیادوں کے کھوکھلے پن کے دکھ کی بجائے اس پر اپنی انا میں مگن نظر آتا ہے۔ ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ صورت ہی کے دو تناظر ہیں۔ ایک شعور کی مجبوری ہے دوسرا وجود کی۔ اب آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ مجھ کو چہرے کی ضرورت ہے، نہ آئینے کی، ہستی کی حاجت ہے نہ نیستی کی ''میں'' کی احتیاج ہے نہ اس کے عکس کی۔

کہیں پر شاعر خود کے بشر ہونے کا بھی ادراک کرتا ہے اور خود کے بھی پوشیدہ رازوں سے حیران ہوتا سوال کرتا نظر آتا ہے۔

یہ تو نے کیا کیا؟
ذرے کے دل میں وسعت کون و مکان رکھ دی
کہاں کی چیز تھی، تیری مشیت نے کہاں رکھ دی (۵۸)

(بشر ہونے کا مطلب، ص۱۷۸)

شہزاد احمد کے ہاں جہاں پر کائنات سے متعلق اور انسانوں سے سیاسی و معاشی اور معاشرتی موضوعات ملتے ہیں۔ وہی پر ان کے لیے مجموعے میں محبت کا موضوع بھی رہا ہے۔ محبت کے موضوع پر ہر مجموعے میں نظمیں ملتی ہیں۔ اس مجموعہ میں بھی محبت کا بیان دلفریب پیرائے میں کیا گیا ہے۔ شہزاد احمد کے ہاں محبت اپنے ہی الگ انداز میں دکھائی دیتی ہے اور محبت میں دوری کا عنصر بھی حائل ہے۔ جس کو شاعر نے مہارت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

محبت ہمیں ایک دوسرے سے
چاہتے ہیں ایک ہو جائیں
مگر ہم ان ستاروں کی طرح ہیں
جو کبھی ایک دوسرے کو چھو نہیں پاتے
ہمیشہ دور ہی سے دیکھتے رہتے ہیں
قربت کی کبھی خوشبو نہیں پاتے (۵۹)

(محبت کل جو تھی، ص۱۸۳)

لہٰذا شہزاد احمد یہ فکر جامہ پہنے ہوئے ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے شاعر نئی صدی کو مستقل قرار دے رہے ہیں جو ان سے آگے ہے۔ موت کا موضوع بھی اس مجموعے میں شامل ہے۔ شاعر نے کائنات اور اس کی ہر حقیقت

کا بیان اور انسان سے جڑے موضوعات کا بیان اور زندگی کی اٹل حقیقت کا بیان یعنی موت اس موضوع پر نظم موجود ہے۔ پیدا ہونے سے لے کر اور جب تک رب کی ذات کے چاہنے تک یا اس کی تقدیر میں جینا لکھا ہو گا تب تک کے دورانیے کو موضوع سخن بنایا۔

موت نے اب بھی تعاقب نہیں چھوڑا میرا
جس طرف جاتا ہوں، وہ ساتھ چلی آتی ہے
جب بھی چلتا ہوں، کسی اور کے چلنے کی صدا آتی ہے
میرے پلٹ کر نہیں تکتا کے مرے ساتھ ہے کون؟
مجھے معلوم ہے سایے کی طرح موت مری تاک میں ہے
مگر میں اس سے گریزاں تو نہیں
بھاگنے کا کبھی سوچوں کیسے؟
چاہتا ہوں وہ میرے ساتھ رہے
مجھے تنہائی کا اک پل نہ ملے
خاک کر دے گا کسی دن مجھے تنہا ہونا
موت سے بڑھ کے نہیں کوئی رفیق
کوئی ایسا نہیں، میں جس سے کہوں
آؤ ہم مل کے سفر کرتے ہیں
موت کا سایہ مرے ساتھ ہے منزل منزل
اے میرے ٹوٹے ہوئے دل
کبھی مایوس نہ ہو
درد کیسا بھی ہو مٹ جاتا ہے
کاش یہ سایہ ابد تک میرے ہمراہ رہے
آج تک موت کا پیچھا نہیں چھوڑا میں نے [٦٠]

(آج تک، ص ١٩١)

موت بالکل سایہ بن کے ساتھ ساتھ پھر رہی ہے۔ جہاں پر شہزاد کی نظموں میں موت کا ذکر ملتا ہے۔ وہی پر ان کے اس مجموعے کی نظموں پر انسان اور اس کی مشین نما زندگی اس کی ادھوری خواہشات اور وقت جس تیز رفتاری سے گزر رہا ہے۔ سب کو یکجا کر کے ایک لڑی میں پرونے کی مانند ہے اور وہ نظم کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ اور کبھی خود کی بے بسی اور خود آگہی میں گھیرے نظر آتے۔ خود کے انسان ہونے پر ادراک کرتے دکھائی دیتے۔ اور خود کو موٹر گاڑی کی مانند سمجھ کر تو اس صورتحال کو بیان کرتے ہیں:

آج مجھ پر کھلا ہے
کہ میں آدمی نام کی کوئی شے ہی نہیں ہوں
میں بھی ان دوڑتی بھاگتی موٹروں کی طرح ہوں
جنہیں اپنے ہونے کا احساس تک بھی نہیں ہے!
خدایا، یہ میرا مقدر ہے
یا میں نے اپنے لیے
جس چمکتے ہوئے راستے کو چنا تھا
کہیں آتا، جاتا نہیں ہے (۶۱)

(ابھی چھ بجے، ص ۲۰۲)

شہزاد احمد کے ہاں ان کی فکر ایک ہی روپ اوڑھے نہیں بلکہ نت نئے پیرایوں میں جھلکتی نظر آتی ہے۔ جو کہ ان کی مرہونِ منت ہے۔

''ٹوٹا ہوا پل'' شہزاد احمد کا نہایت اہم شعری مجموعہ ہے۔ جو کہ ۲۰۱۰ء میں شائع ہوا۔ یہ اس لیے اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں ان کی زندگی کے حیرت انگیز اور ناقابل فراموش واقعے کی یادگار ہے۔ وہ یہ کہ مارچ ۱۹۸۴ء میں شہزاد احمد ہارٹ اٹیک کا شکار ہوئے اور چند ہی لمحوں بعد ان کی موت واقع ہوگئی۔ شہزاد احمد کو (Clinicaly dead) قرار دے گیا گیا۔ مگر پھر ڈاکٹرز کی انتھک کوششوں سے مصنوعی طریقے سے دل کو چلانے کی کوشش کی گئی۔ جو بالآخر کارآمد ثابت ہوئی اور اس طرح شہزاد احمد کو ایک نئی زندگی عطا ہوئی۔

''ٹوٹا ہوا پل'' کا انتساب بھی ماہر امراض قلب ڈاکٹر سید اسلم کے نام کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر سید اسلم کی کتاب ''قلب'' محتاج تعارف نہیں۔

"ٹوٹا ہوا پل" کی نظموں میں اس لمحے کی بازآفرینی موجود ہے۔ اس میں بھی غزلیں کثیر تعداد میں ہے۔ بہ نسبت نظموں کے اور نظموں میں سائنسی اشارات زیادہ ملتے ہیں اور ایک طویل عرصے تک زندگی اور موت کی کشمکش میں ہے۔ پھر ان سب کا بیان ان کی غزلوں اور نظموں میں بھی خاص کر لیا گیا۔

موت کو قریب سے دیکھنا یہ تجربہ شہزاد احمد نے کیا اور پھر اس کو متوازن اور سلیس انداز میں بیان کیا، اس دکھ، تکلیف کو سب سے بڑھ کر اس وقت کے احساسات کو سب کا بیان اس مجموعے کی نظموں میں ملتا ہے۔ مجموعے کی نظموں کے موضوعات سے ہی اس سب کا پتا چلتا کہ کیا پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ موت کا کار فرمائی کا بیان ملتا تو کہیں زندگی کی بے ثباتی، اور اس دور ناگوار میں جینا اور حقیقی زندگی یعنی آخرت کی زندگی دونوں میں دشواریوں کا سامان کرنا سب کو سنجیدگی سے پیش کیا گیا۔ اس دنیا میں بھی مصائب اور اعمال کا حساب جو کہ آخرت کے دن ہونا۔ اس جہان کا کیا اگلے جہان میں جا کر جوابدہ ہونا۔

یا جینا مرنا کھیل ہے سب
آگے بھی رستہ کوئی نہیں
آگے بھی وہی دوراہا ہے (۶۲)

(نیند اُچاٹ کرنے والی ایک نظم، ص۱۴۸)

انسانی بے حسی، بے بسی اور ناچارگی اور انسان کے بیٹھے دیکھتے رہنا رات دن کا آنا، ساری مخلوق سوئی ہوئی ہے۔ بیداری کا کسی کو خیال نہیں۔ سب اپنی ہستی ناساز میں مگن نظر آئے۔ نہ کہ سوچ بچار کرتے۔ ہر چیز کسی مقصد وجہ سے پیدا کی گئی۔ انسان کے ساتھ پیش آنے والے حالات و واقعات، جذبات و احساسات کی کار فرمائی سب کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ان نظموں میں۔

ایک دائرہ ہے جس میں ہر چیز گھومتی ہے
ہے رقص میں یہ عالم تصویر جھومتی ہے
اب دن بھی ایک جیسے راتیں بھی ایک جیسی ہے
ہوتی ہیں اپنے دل سے باتیں بھی ایک جیسی
سو بار میں نے چاہا ٹوٹا نہیں یہ دھاگا
دن بھر بھی جاگنا ہے میں رات بھر بھی جاگا

مخلوق سو رہی ہے

پھر صبح ہو رہی ہے (۶۳)

(پھر صبح ہو رہی ہے، ص ۱۵۴)

اس کہانی کو پیش کرتی ہے شہزاد احمد کی نظمیں جس میں انسان سے وابستہ قدریں بے معنی ہو چکی اور ہر بات کا فیصلہ مارکیٹنگ پر ہوتا۔ منافع کے لالچ میں انسان خود کو پستی میں گاڑے نظر آتا ہے۔ اب تو صبح ہو یا شام تقدیر کا فیصلہ کرتی بھی یہ کارپوریشنیں نظر آتی ہے اور طے کرتے دکھائی دیتے کہ دنیا کی نئی ترتیب کیا ہو گی۔

کن لوگوں کو مرنا ہو گا اور کتنے انسان زندہ رہنے کے قائل۔ اجتماعی انسانی سوچوں کا تو خاتمہ ہو چکا ہے اور وجودِ انسانی کو لاحق خوفناک خطرات کے بارے میں غور و فکر کرنے اور ان سے بچنے کا لائحہ عمل تیار کرنے کا وقت باقی نہیں رہا اور ہر آدمی نیند ہی میں زندگی گزار رہا ہے۔

آدمی کے سوچ بچار کرنے کا کوئی مرحلہ ہی نہیں رہا۔ ہر کوئی خود کی انا اور فائدے میں لگا ہے کہ اور ایسی نیند میں ہے کہ جس سے بیداری کے خیال کا تو کہیں نام و نشاں نہیں۔ اس پورے مجموعے میں موت کے تجربے کو زیادہ صراحت اور تفصیلات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

موت کے تجربہ کو جس سلیس انداز میں اور اس وقت درپیش آنے والے سبھی مناظر کی تصویر کشی کی گئی۔ یہ سب نئی زندگی ملنے کے بعد ممکن ہو پایا۔ سائنسی علوم کا گہرا مطالعہ رکھا تھا اور اس مہارت سے اس کو بھی بیان کیا کہ یوں لگتا یہ اسی کا حصہ ہو۔ سائنسی اشارات اسی لیے ان کی نظموں میں زیادہ ملتے ہیں۔ اس کی مثال ان کی ایک نظم جو کہ اس مجموعے کی بہ نسبت دیگر نظموں کے زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔

پیشِ خدمت ہے:

ابھی تو نے دیکھا نہیں آسماں کی طرف

ابھی تو زمینوں کے ذروں میں مصروف ہے

ابھی تو نے سوچا نہیں

یہ ستارے بہت دور ہوتے ہوئے بھی

بہت پاس کیوں ہیں؟

ابھی چاند کا آئینہ اتنا شفاف کیوں ہے

زمیں اپنے سینے پہ کہسار کا بوجھ لادے
کدھر جا رہی ہے!
یہ جھیلیں جو گدلا چکی ہیں
سسکتی ہوئی زرد دھرتی کے ناسور ہیں
اور یہ فصلیں جو اس وقت شاداب ہیں
کل جھلس جائیں گی
کل جو آیا نہیں
سب کی نظریں اسی پر لگی ہیں
مگر آج، جو آج موجود ہے کتنا بے مایہ ہے
وقت کی لہر بھی کتنی عجیب چیز ہے
جب گزرتی ہے احساس تک ہم کو ہوتا نہیں ہے
اور کہنے کو ہم بھی اسی لہر کے منتظر ہیں(۶۴)

(ابھی تو نے دیکھا نہیں، ص۱۵۵)

اس مجموعے میں غزلوں کی بہ نسبت نظمیں زیادہ ہیں جو کہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس مجموعے میں شہزاد ایک نظم گو شاعر کے طور نظر آتے ہیں۔ بیشتر نظموں کے علاوہ اس مجموعے کی دیگر نثری نظمیں بھی قابل توجہ ہیں۔ ان کے اس مجموعے میں فلسفیانہ انداز فکر سائنسی شعور کے عناصر بھی نمایاں ہیں۔

"اگر شہزاد احمد نے "ابھی تو نے دیکھا نہیں" اور "اکائی" ایسی چند نظمیں کہہ کر بھی اپنا دل ہلکا کر لیا ہوتا تو ہم انہیں ذرا بلند آہنگ داد دے کر اپنی تنقید کا سکہ رائج الوقت دو چار اصطلاحات برت کر کام چلا لیتے۔ اس کے اور بھی اگر کچھ ضرورت پیش آتی تو پھر آخری جائے پناہ تصوف سے رجوع کرتے اور کچھ وجود و شہود کے حوالوں سے اپنی تنقید کی کم مائیگی کا ازالہ شہزاد کی خوشی کا سامان کرتے۔۔۔ شہزاد احمد کے یہ دونوں مجموعے عقلی، فکری اور سائنسی فلٹرز کے ذریعے غور و خوض کرانے والے دماغ کے فکر و نظر کا اشاریہ ہے۔"(۶۵)

شہزاد احمد کے ہاں سائنسی شعور اور عقلی عناصر کی کار فرمائی کثرت سے نظر آتی ہے۔

اس مجموعے کی ہر ایک نظم چاہے عام تاثر میں لکھی گئی ہو یا نہایت اہم وارداتِ قلبی پر سب اپنے آپ میں ایک کل کی مانند ہے۔ سوچ نئے نئے پہناوے پہنے نظر آتی ہے۔ زندگی کا موت، جذبات احساسات، آخرت، خودی کی پہچان، اور دل جو صرف ایک دھڑکتا ہوا نہیں بلکہ اس میں بے شمار احساسات کا مجموعہ، زمین و آسمان سب کا بیان اس مجموعے کی خاصیت ہے۔ نہایت پُر اثر انداز میں۔

مگر یہ ایک رخ ہے!

دوسری جانب

مجھے اپنے بدن کی وسعتوں سے خوف آتا ہے

مرے اک سمت سورج

دوسری جانب ستارے ہیں

مرے پاؤں کے نیچے اک سمندر موجزن ہے

اور سر پر آسمانوں کی بلندی ہے

میں نقطوں میں گھرا ہوں

ہر طرف نقطے ہی نقطے ہیں

کسی نقطے سے آغازِ سفر کرنا پڑے گا؟

کاش یہ نقطے

سمٹ کر ایک ہو جاتے (۲۲)

(اکائی، ص ۱۵۹)

آدمی نقطوں میں بٹا ہوا ہے۔ کہیں یہ کسی مقصد کا آغاز تو کہیں یہ کسی سفر کا اختتام معلوم ہوتا ہے۔

شہزاد احمد نے اس مجموعے میں کشمیر کے پس منظر میں بھی نظم کو لکھا شامل کیا۔ آپ کشمیر کے حالات کو سیاسی تناظر میں دیکھنے کی بجائے خالص انسانی تناظر میں دیکھتے ملتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے کہ اس خطے میں مسلمان آباد ہیں۔ جن پر ہندو افواج لاکھوں کی تعداد میں عرصہ حیات ان کا تنگ کر رہی ہے بلکہ ان کا مطمع نظر انسانی روح پر گزرنے والے حادثات کو محسوس کرتا نظر آتا ہے۔ تو کہیں اس کے حسن کی دلفریب انداز میں ذکر کرتے نظر آتے ہیں اور اس کے حسن و جمال کی بربادی کا غیر سیاسی زبان میں بیان کردہ افسانہ ہے۔ ہندو افواج کے ظلم کی روداد ہو جیسے:

دیکھ ہر سمت سے شعلے اٹھے
اجنبی کون ہے تو؟[۶۷]

(اجنبی کون ہے تو، ص۱۶۶)

اور اس مجموعہ میں شاعر نے موت کو ایک نئے زاویے سے دیکھا اور قاری کو دکھایا۔ عمومی طور پر تو موت کو زندگی کی دشمن سمجھا جاتا ہے۔ مگر شہزاد احمد کے ہاں موت غم خوار، مونس اور ہم دم کی صورت دکھایا۔ اس کی اس مجموعے کی نظموں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زندگی و موت اور دنیا کو اپنے ہی ایک الگ زاویے سے دیکھتے ہیں۔

لہٰذا ان نظموں میں جو تجربہ بیان ہوا ہے وہ اس لحاظ سے الگ ہے کہ بہت کم شاعر اس تجربے سے گزرے ہیں۔ مگر شہزاد احمد نے جس سہولت کے ساتھ سلیس و سادہ انداز میں بیان کر دیا اس وجہ سے یہ واقعہ غیر مانوس معلوم نہیں ہوتا۔ موت کے تجربے سے گزرنا خود ایک تخلیقی عمل ہے۔ موت کے موضوع کو نت نئے انداز اور مختلف زاویہ نگاہ سے بیان کیا گیا ہے اور وہی پر انہوں نے موت کے اس لمحے میں جو واردات قلبی پیش آئی ان سب کو متنوع شکل میں بیان کر دیا۔ وہی پر اس لمحے آنکھوں کے سامنے پیش آنے والی تصویریں اور بعد میں سوچ نے ایک نیا موڑ لیا اور اس لمحے کے بعد جو بدلاؤ محسوس کیا جذبات میں جو نیاپن محسوس کیا ان سب کو بیان کرتے اس مجموعے میں دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی نظم (اپنی سالگرہ پر ایک نظم) اور (پھر یوں ہوا) بھی سائنسی شعور کی عکاسی کرتی ہیں۔

پھر میں نے سوچا
اس سارے انٹلکٹ کا کیا فائدہ
جب میں ایک عورت کو بھی نہ سمجھ پایا
اور اب وہ عورت میرے اندر
فنگس کی طرح پھیل گئی ہے
اور میں نے محفلوں میں جانا چھوڑ دیا ہے[۶۸]

(پھر یوں ہوا، ص۱۷۷)

اس مجموعے کے آخر میں ایک نظم (ساقی نامہ) کے عنوان سے ہے۔ یہ نظم اپنے مزاج اور تخلیقی سبھاؤ میں ساقی نامے کی روایت سے مکمل طور پر آہنگ ہے۔ گویا ان نثروں میں گہرا اشتراک نظر آتا ہے۔

یہ نظم میں فکر کا زاویہ بے حد گہرے مطالعے اور ان گنت موضوعات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے نظر آتی ہے۔ خواہ محبت کا جذبہ، ایمان کی سربلندی کی خاطر سر کٹوانے کی روداد، زمین پر ہونے والے واقعات کا بیان، ستاروں کو بنا غور و فکر کے دیکھتے رہنے کا عمل، سیاسی و سماجی، معاشی و معاشرتی عوامل کی کارفرمائیاں، غلامی، جمہوریت، فلسفہ اور خود انسان کا لالچ، بے بس، بے حسی، اخلاقی گراوٹ، خود آگہی سے دوری، مگر ان سب کے بعد میں خود کو کچھ نہ سمجھنے کا یہ زاویہ سب کچھ جھیلنے کے بعد ان سب کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ یہ نظم جس میں شہزاد احمد کی سوچ یوں لگتا ہے کہ عقاب پر پھیلائے زمین و آسمان کی وسعتوں میں ہر رنگ کو اپنائے اور موضوعات کو بیان کیے جارہا ہو۔ شہزاد احمد کی یہ عمدہ مہارت قابل دید ہے۔

میں کیا چیز ہوں، خود نہیں جانتا
وہ شے دے کہ آرام سے مر سکوں[۶۹]

(ساقی نامہ، ص۱۹۵)

فقط ایک ذرے میں ہے کائنات
مگر ایک ذرہ نہیں شش جہات[۷۰]
(ساقی نامہ، ص۱۹۰)

"جہاں پاؤں رکھا زمین چھین لیں گئی
کبھی اپنے مہروں کو آگے کیا
کبھی فلسفہ ان کا ہتھیار تھا
کبھی پیٹ ہر شے کا معیار تھا"[۷۱]

(ساقی نامہ، ص۱۸۸)

ہے اک کھینچا تانی میں ہر ایک شے
خدا دو نہیں لیکن زمیں ایک ہے[۷۲]

(ساقی نامہ، ص۱۸۸)

شہزاد احمد کا شعری مجموعہ جو ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا اور دیکھنے میں مطالعہ سے ''مٹی جیسے لوگ'' ایک مشکل کتاب معلوم ہوتی ہے اور عنوان سے ہی اس کا موضوع سخن معلوم ہوتا ہے۔ اس مجموعہ میں نظموں کی تعداد بہ نسبت غزل زیادہ ہے اور ہر نظم عنوان سے ہی اپنے آپ میں ایک اکائی ہے۔ اس مجموعے میں:

''ایک ایسی المناکی ہے جو صرف ذہن اور احساس تک محدود نہیں ہے بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس نے وہ لامحدود پھیلاؤ اختیار کر لیا ہے۔ جو انسان ہی کو نہیں، کائنات ہی کو نہیں، خود حقیقت کو بھی اس کے تمام نفسی و آفاقی عناصر سمیت اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے۔ جو ہے وہ بھی اور جو نہیں ہے وہ بھی، سب کچھ اس طغیانی پر بننے اور مٹنے والے بلبلے ہیں۔''(۷۳)

اس مجموعہ کلام میں بے شمار متنوع موضوعات فکری لب ولہجہ اپنائے اور بلند شعورِ سطح پر بیان سوچ بچار سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے شاعر نے نہایت تخلیقی، تجرباتی عناصر کی ہے۔

''عجیب رُت''

عجیب رُت ہے
کوئی پرندہ کہیں نہیں ہے
کئی دنوں سے کوئی ستارہ بھی دیکھنے کو نہیں ملا ہے
میں سوچتا ہوں کہ میری آنکھیں
بہت پرانی نہ ہو چکی ہوں
جو آسمانوں پہ اُن ستاروں کو ڈھونڈتی ہیں
جو اس زمیں کی غبار آلود وسعتوں میں چھپے ہوئے ہیں

وہ چہچہاتے ہوئے پرندے
جو صبح و شام اتنا شور کرتے تھے
کانپ اُٹھتا تھا پتا پتا
لرزنے لگتی تھی وہ ہوائیں

جو اک قدم بھی چلی نہیں تھیں

مگر اب اتنا سکوت کیوں ہے؟
کہاں پرندے چلے گئے ہیں!
ستارے معدوم ہو گئے ہیں!
کوئی نہیں ہے
کیسے بتاؤں
میں ڈر گیا ہوں
میں مر گیا ہوں! (۷۴)

(عجیب رُت)

کیسی حیرت انگیز فضا جنم لے رہی ہے کہ انسانی قدروں کی کمی نے نہ انسانوں کو صرف بلکہ چرند پرند کو بھی متاثر کیا۔ اور اپنی اس دنیاوی زندگی رکھ رکھاؤ، میں اتنا آگے نکل چکا ہے کہ کسی سے ہمدردی کا روادار نہیں۔

شاید میری آنکھیں پرانی ہو گئیں مگر منظر وہی ہے۔ سکوت کی مانند، اجڑا ہوا جیسے دیس، جس میں نہ محبت، ہمدردی، نرم دلی جیسے گوشے ناپید ہو رہے ہیں اور آدمی کو اس کو اس کا احساس تک نہیں۔ تو کہیں لگتا ہے کہ خود سے سوال کرتے نظر آتے اور مخفی گوشوں کو کھنگالنے میں سرگرم عمل نظر آتے۔

"میں کس دنیا میں رہتا ہوں"

میں کس دنیا میں رہتا ہوں
میرے چاروں طرف یہ تہ در تہ بے زاری کیوں ہے؟
اس دنیا سے بھاگنے کی تیاری کیوں ہے؟
جو بازی ہم جیت چکے تھے،
ہاری کیوں ہے؟

میں بھی عجب دیوانہ ہوں
اپنی جیبوں میں وہ کہکشائیں بھر لایا ہوں

جو ابھی پیدا ہونے والی ہیں!
میرے کوٹ کی باقی جیبیں،
دیکھنے میں خالی لگتی ہیں
لیکن ان میں
میرے لٹے ہوئے ماضی کا رونا دھونا ہے
ہر لمحہ میں سوچتا ہوں
اب کیا کرنا ہے؟
کیا ہونا ہے؟

تم کہتے ہو
میں خود اپنی آگ میں جلنے والا اک پتا ہوں
لیکن ہر اک پتے کا کوئی درخت تو ہوتا ہے!
مجھے بتاؤ۔۔۔میرا درخت کہاں ہے؟
یا پھر مجھ کو پتا ہونے کا الزام نہ دو!

میں شاید کبھی بھی تو نہیں ہوں
لیکن جل تو رہا ہوں
روشن بھی ہوں
دور سے پہچانا بھی جاتا ہوں (۷۵)

(میں کس دنیا میں رہتا ہوں)

احساسات کی ترجمانی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ احساس کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ تجربہ کی وسعتِ بیانی اور لب و لہجے کی چاشنی یوں محسوس ہونا۔ شاعر نے اس مجموعے میں عقل کی بجائے جذبات سے کام لیا اور جذبات کی ترجمانی کرتے نظر آتا ہے۔

نظم "چیونٹیاں"

ہزاروں چیونٹیاں کیسے مرے بستر تک آ پہنچی؟
تھکے ہارے بدن میں کوئی شرینی نہیں تھی
وہ کپڑے بھی اُسی دن میں نے خود دھوئے تھے
خود ہی دھوپ میں ڈالے تھے۔۔۔پہلے تھے
مرے بستر پہ کوئی داغ یا دھبا نہیں تھا
مرا تکیہ نیا تھا، چند دن پہلے خریدا تھا

سب کچھ تھا
تو پھر یہ چیونٹیاں آئی سے تھیں؟
مرے اندر کسی خوشبو کا مسکن تھا!
کہ میٹھی نیند کے ریزے کہیں بکھرے ہوئے تھے

میں ایسا پیڑ تھا، جس کی ہر اک ٹہنی ہری تھی
مری ساری جڑیں سوکھی ہوئی تھیں
اور یہ ہریالی تمنا ہونے والی تھی
مگر تم کون ہو؟
اور تم کو چاہنے کا حق
ودیعت کس کی جانب سے ہوا ہے!
یہاں کوئی نہیں جو طاقت نظارہ رکھتا ہو
یہاں کوئی نہیں جو ذہن کو آوارہ رکھتا ہو!

سنو! یہ بند آنکھیں کھول دو
اب دیکھنے کو کچھ نہیں ہے
کوئی شیشہ، کوئی آئینہ

ممکن ہے کہیں موجود ہو
لیکن کہیں چہرہ نہیں
آنکھیں نہیں!
کچھ بھی نہیں (۷۶)

(چیونٹیاں)

وجود و شعور کا بیان دونوں ساتھ ساتھ دیکھنے کو ملتے ہیں اور یہ جہان جہاں پر حسد، بغض کی فضائیں سانس لے رہی ہے۔ انسان کی موجود ہوتے بھی اس جہان فانی میں موجود نہیں کہ جہاں ہر طرف یوں محسوس ہوتا کہ آگ کے گولے ہیں اور کہیں سے بھی پڑ سکتے ہیں۔ یہ جہاں یہاں آدمی کا آدمی سے ناطہ مفاد کی حد تک محدود ہو گیا ہے۔ خرد کی کوئی انسان کی قدر و قیمت نہیں سمجھی۔ اس ناپائیدار زاویے کی سمت دوڑ رہے ہیں۔ جہاں نہ منزل کا پتہ اور نہ دوران سفر پیش آنے والے واقعات کا بس دوڑے جا رہا ہے۔ ٹھہراؤ تو کہیں ہے ہی نہیں۔ بالکل جذبات و احساسات سے عاری ہوتا جا رہا ہے۔ لمحہ فکریہ ہے جس کی نہ جہان کو اور نہ آدمی کو پرواہ ہے۔ اس ناآسودہ ماحول میں کھوکھلے پن کا شکار ہو کر عجیب عجیب طرح سانسیں لے رہا ہے۔

"یہ کیسا ٹوٹا بنتا جہاں ہے"

یہ کیسا ٹوٹا بنتا جہاں ہیں
جس کی دیواریں کبھی قائم نہیں رہتیں
کبھی چھت ہی نہیں ہوتی
کبھی دروازے ہوتے ہیں
مگر ان میں گزرنے کے لیے رستہ نہیں ہوتا

یہ کیسا ٹوٹا پھوٹا سا جہاں تو نے بنایا ہے
جہاں اینٹیں نہیں ہیں
آگ کے گولے ہیں
جو ایک دوسرے کے ساتھ جلتے ہیں
کوئی بائیں طرف جاتا ہے

اور پھیلے ہوئے ساکت خلا میں
خود ہی جل کر راکھ ہو جاتا ہے
باقی کچھ نہیں بچتا!
کوئی دائیں طرف جاتا ہے
اور اندھے کنویں میں
اپنی آتش گیر ہستی میں
جلا پاتا ہے
یا پھر آگ کو بھڑکاتا رہتا ہے

یہ کیسا سلسلہ ہے جس کے دھاگے
ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں
کوئی ماضی کی طرف جاتا ہے۔۔۔
جاتا ہی چلا جاتا ہے
کوئی آگے کی جانب سفر کرتا ہے
لیکن اپنے ماضی میں
کبھی اتنی بھی وہ مہلت نہیں پاتا
کہ اس جانب نکل جائے
جدھر کوئی نہیں جاتا!

یہ عالم اک زمانے سے یہاں موجود ہے
لیکن کہاں ہے؟
کیا اسے محسوس کرنے کے لیے
محسوس کرنے کی صلاحیت
ہمیں کھونی پڑے گی

ہم بھی اس بنتے ہوئے، مٹتے ہوئے

لمحے کی صورت ہیں

جو ہے بھی اور نہیں بھی ہے!(۷۷)

(یہ کیسا ٹوٹتا بنتا جہاں ہے، ص ۷۶)

"ایک بلبلے میں"، "کوئی مجھ کو بتائے"، کوئی آئے جو مجھے آواز دے"، "چپ ہو جاؤ"، "نیند میں سفر" یہ نظمیں انسان کی ناپائیدار زندگی کے لمحات، ایک انسان کا دوسرے انسان سے لاتعلقی، جہالت سے بیداری کی طرف اور زندگی جو ایک بلبلے کی مانند جانے کب، کیسے اور کہاں انجام کو پہنچ جائے۔ اور اگر میں بولتا بھی ہوں تو میری خود کی آواز خود کے کانوں میں گونجتی ہے۔ دنیا میں اس قدر شور اور شور بھی وہ جس میں نہ کھل کر سانس لینا ممکن ہے۔ کوئی آواز دے بھی تو شور ایسا کہ آواز تک کی رسائی ممکن نہیں۔ دستِ سوال بھی ہوں اور سوال بھی معلوم نہیں۔

"میں بھی خاموش رہا

میں نے سوچا

کہ میرے پاس تو کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں"(۷۸)

نیند میں سفر در سفر کیے جا رہا۔ اصل بیداری سے ناآشنا۔ جس سمت بھی سفر کرتا ہے اس سمت میں انجان موڑ آتے ہیں کہ پھر سے رختِ سفر / سفر ہوں اور وہ سفر وہی سمت کیے جا رہا ہوں جو نیند میں دیکھی۔ نہ منزل کی خبر نہ ہی مقصدِ سفر کی پرواہ۔

مگر یہ اور ہی کچھ

کیا مرا اپنا کوئی انداز ہے، بہروپ ہے

کوئی بھیانک خواب ہے

میں نیند کے اندر سفر کرنے کا عادی ہوں

تو کیا سارا سفر پھر سے مجھے کرنا پڑے گا(۷۹)

بہت ممکن ہے

وہ رستہ خود اپنی سمت ہی تبدیل کر بیٹھا ہو

اور میں چلتے
اجنبی نا آشنا لوگوں میں گھر جاؤں
مر اسارا سفر جو 'میں' سے 'میں' تک ہے [۸۰]

خود ہی زنجیر بنائی ہم نے
خود کو پہنائی بھی
اور رقص بھی ہم نے ہی کیا
ہمیں آزادی سے ڈر لگتا ہے
کون آگاہی کا یہ بوجھ اٹھائے۔۔۔ چھوڑو!
بند ہی رہنے دو دروازے کو
اور اگر ممکن ہو
اسے کچھ اور مقفّل کر دو! [۸۱]

رب نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا اور شعور سمیت بے شمار نعمتوں سے نوازا۔ یہ جنگل، صحرا، سمندر مہلت ہی کب دیتے کہ کچھ اپنے بارے میں سوچ سکوں۔ یہ کائنات اتنی وسعت کی حامل ہے کہ انسان کی سوچ کم پڑ جاتی ہے اور شاید یہی سب کچھ کہیں میرے اندر ہے۔ جو باہر بھی دکھائی دے رہا ہے۔ فکرِ معاش ہے کہ کچھ اور سوچنے نہیں دیتی۔ ان سب کا فکری بیانیہ شہزاد احمد کی نظموں کا وصف ہے۔ ان گنت موضوعات شہزاد احمد کی نظموں میں حائل ہیں کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ سمندر جتنا گہرا ہوتا ہے۔ اس میں وسعت کا عنصر بھی اتنا بے بہا ہے اور یہ ہی صورتحال شہزاد احمد کی نظموں کی ہے۔ جو مختلف سانچوں میں ڈھلے رواں دواں ہے۔

مجھ کو یہ تو فکر نہیں، میں کون ہوں؟

میرے لیے زندہ رہنا ہی سب سے بڑی حقیقت ہے [۸۲]

اندر ہی اندر گھٹے جانا بے وجہ کی پابندیاں، فرسودہ رسم و رواج نے زندگی کو جینے اور کھل کر سانس لینے کے لیے جینا دوبھر کر دیا۔ پھر ان سب کے بعد دل خراش نکلنے والے نتیجے ناساز حالات و واقعات کا سامنا کرنا پڑتا۔

میں کھل کر سانس لینا چاہتا ہوں

مگر کالی ہواؤں نے مجھے محبوس کر رکھا ہے
دیواریں میرے چاروں طرف اگنے لگی ہیں (۸۳)

کوئی آئے مجھے اس خوف سے باہر نکالے
عطا کر دے مجھے تابندگی یا مار ڈالے (۸۴)

شہزاد احمد کی نظموں میں جو فکر کی کار فرمائی ہوتی ہے وہ کسی نہ کسی واقعہ، حالات، جذبات و احساسات، خود آگہی، فلسفہ، نفسیات، سائنسی شعور اور حسن و جمال کی الغرض کائنات کے ذرے ذرے کی بازیافت معلوم ہوتی ہے۔

''بہت تھک گیا ہوں''، ''مٹی جیسے لوگ''، ''روز کی طرح اخبار آیا ہوا ہے'' ان سب نظموں میں ان سب کی کار فرما ملتی ہے۔ دنیا اور حشر کی منظر کشی کی گئی ہے۔ انسان کے لیے المیہ فکریہ ہے یہ۔

شہزاد احمد کی نظم ''اے خدا'' دیکھنے میں عام سی، عام فہم اور چنیدہ چنیدہ لفظوں کے چناؤ سے ساخت کے لحاظ کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ معنی و مفاہیم سمیٹے نظر آتی ہے۔ انسان کی اس دنیا میں دو چار دن کی زندگی کی عکاس یہ نظم۔ انسان کو دوسرے انسانوں کے اندر کا پتا چل جائے معلوم ہو جائے اور آگہی آجائے تو اس کو نفرت ہونے لگے۔ اس دوہری شخصیت کے حامل انسان سے اندر سے اور باہر سے اور خود ہی خود کے لیے سوالیہ نشان بنا ہوا۔

اے خدا!

آگہی سے بچا (۸۵)

انسان فرقوں میں بٹا ہوا ہے۔ بٹنے کے تکلیف دہ مراحل پر اس طرح گامزن کہ کسی چیز کی کوئی پرواہ نہیں۔ سب ایک ہے۔

محو ہو جائیں خواب آنکھوں سے
یاد ہم کو نہ کوئی بات رہے
حشر تک ایک ہُو کا عالم ہو
اور باقی نہ کوئی ذات رہے (۸۶)

شہزاد احمد کے ہاں کہیں وقت کی کمی تو کبھی وقت کی تیز رفتاری کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں تو کہیں خواہش جہان کو دیکھنے کی۔ کس تیز رفتاری سے کبھی وقت گزر رہا تو کہیں رکا ہوا محسوس ہوتا۔ کبھی کمی کا احساس تو پھر وقت ہی وقت کسی بھی چیز کا ہو ہمیشہ کے لیے رہنے کا جیسے رک سا گیا ہو۔ روانی میں کمی آگئی ہو جیسے۔ زمیں تو اس خاک سے بنے انسان کے بوجھ اٹھانے کے لیے بنائی گئی۔ کچھ کر دکھانے کی لگن اور وقت کی قدر اس کی عکاسی کرتی محسوس ہوتی ہیں نظمیں۔

چلو اب کہو، جو بھی کہنا ہے کھل کر کہو
سانس موجود رہے، لفظ موجود ہیں
وقت کی کیا کمی ہے
ازل سے ابد تک یہاں وقت ہی وقت ہے (۸۷)

جب تک سانس میں سانس ہے تب تک وقت کی کیا کمی۔ دنیا کو دیکھنے کی خواہش کہ پہلے آغاز سفر کا نہیں معلوم تھا۔ مگر چلا ہوں تو اب پاؤں کا رکنا محال ہے۔ چاہتا تھا کہ دنیا دیکھوں اس ادھوری خواہش کی عکاس یہ نظم۔

سفر پہ نکلو تو یہ بات دھیان میں رکھنا
کبھی مجھے بھی جہاں دیکھنے کی خواہش تھی (۸۸)

ہاتھ کچھ کرنے سے عاری جب کہ آنکھیں دیکھنے سے۔ دونوں کے درمیاں فاصلہ اتنا ہے کہ جو دیکھ رہا وہ حاصل کر دشوار لگ رہا ہے اور ہاتھ جو یہ فاصلہ نہ کچھ کرنے دے رہا نہ ہونے دے رہا ہے۔ حاصل اور لاحاصل کی کشمکش میں ہوں۔

جو کچھ حاصل ہوا ہے
وہ بھی لاحاصل ہے!
میری آنکھیں دور خلا میں گھور رہی ہیں
اور خلا میرے ہاتھوں کو دیکھ رہا ہے
میرے ہاتھ جیسے خلا ہیں (۸۹)

انسان کا اپنے اصل کو چھوڑنا یہ تو ناممکن لگتا ہے۔ اک بے نام سا غم ہے کہ یہ دنیا کی آسائشیں جیسے چپک گئی ہیں۔ اب ان کو کیسے ترک کروں اور اپنے اصل کی طرف بڑھنا ناممکن ہوتا جا رہا۔ اس دنیاوی چیزوں نے اندر سے کھوکھلا

کر دیا۔ جسم کو تو سامانِ آرائش میسر کر دیا مگر اندر کا کیا۔ اس اندر میں جس کا نام روح اس کے لیے کیا کیا۔ یہ غم کو کھائے جا رہا ہے۔ ایسے موضوعات بھی شہزاد احمد کی نظموں میں پائے جاتے ہیں۔

باہر کی پرواہ ہے۔ اندر بھلے بنجر ہوتا جا رہا ہوں۔ ہم ہیں کہ سامنے سے دیکھنے رہنے میں لگے رہتے ہیں مگر اندر بھی اک جہاں بستا ہے۔ اس کی کوئی فکر ہے جو اصل ہے جس کے بغیر سب ادھورا نامکمل۔

دنیا اور انسانوں نے ترقی کی منازل تو طے کر لی مگر اپنی بنیاد کے لیے کوئی سر و سامان نہیں۔ آنکھیں ہیں کہ باہر کی طرف لگی ہوئی۔ اندر سے تو بند ہو جیسے دیوار کھڑی ہو۔

شہزاد احمد کی نظموں میں جہاں کائنات، انسان، فلسفہ اور نفسیاتی علوم ہائے فکر کا ذکر ملتا ہے وہیں پر ان میں دنیا و آخرت کے موضوعات بھی پائے جاتے ہیں۔

جتنی اس مجموعے کی غزلیں اہمیت کی حامل ہیں اتنی ہی نظمیں بھی۔ اور ان نظموں کا بھی پوری یکسوئی سے مطالعہ کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ ہم ان احوال میں اترنے کا تجربہ حاصل کر سکیں۔ جو شاعر نے اس پورے مجموعے میں بیان کرنے کی سعی کی ہے جو ذہن کی گنجائش سے زیادہ اور احساس کی صلاحیت سے بڑھ کر ہیں۔ اس کی سب سے اہم نظمیں جن کا سرسری مطالعہ کرتے گزر جانا خود اپنے اوپر ظلم ہوگا۔ ''عجیب رت ہے''، ''میں کس دنیا میں رہتا ہوں''، ''چیونٹیاں''، ''یہ کیسا ٹوٹتا بنتا جہاں ہے''، ''ایک بلبلے میں''، ''کوئی صورت نہیں''، ''کب تک تمہیں ڈھونڈنا پڑے گا'' اور ''کوئی صورت نہیں''، ''کب تک تمہیں ڈھونڈنا پڑے گا'' اور ''آخری خواب'' یہ سب اس مجموعہ کلام کی بنیادی نظمیں ہیں۔

اس مجموعے کی نظموں کے مطالعہ سے قاری کے شعور کو بھی وسعت ملے گی اور وجود کو بھی۔

''اربوں سال کی دوری'' شہزاد احمد کا سولہواں شعری مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ بھی بیشتر مجموعوں کی طرح نظم و غزل دونوں بنیادی اصنافِ شعر پر منحصر ہے۔ جس میں موضوعات کے مطالعہ سے یوں لگتا ہے کہ اکیسویں صدی کا مزاج گھلا ہوا ہو۔ شہزاد احمد ابتدا ہی سے نئے نئے مضامین اور نت نئے پیرایوں کے متلاشی دکھائی دیتے ہیں۔ بنے بنائی سانچوں سے متفق نہیں ہوتے بلکہ اپنے لیے خود اپنی راہ ہموار کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے ان مجموعوں کے مطالعہ سے یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ شہزاد احمد کا تخلیقی عمل سے زیادہ سروکار نئے پن کی آرزو ہے۔ عشقیہ موضوعات بھی رنگین پیرائے میں ملتے رہے۔

"شہزاد احمد ایسے شاعر ہیں۔ جن کے ہر مجموعے میں استعاراتی، اسلوبی اور موضوعاتی حوالے سے تنوع ملتا ہے۔ انہوں نے مختلف زمانوں میں تخلیق ہونے والی اپنی شاعری میں سیاسی، سماجی اور ادبی تبدیلیوں کو ہمیشہ ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔"(۹۰)

ہر آدمی نیند میں ہی زندگی گزار رہا ہے۔ آدمی کی اس تمام صورت حال کو شہزاد احمد نے نہایت چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ بیداری کا عنصر اس مجموعہ میں نمایاں نظر آتا ہے۔ وہیں پر عشقیہ موضوعات کی نظمیں بھی شامل مجموعہ ہیں۔ محبوب کا کچھ کہنا نہ کہنا، دیکھنا نہ دیکھنا اور جب کہ عاشق جو کہ اس کی ایک نظر کا منتظر ہے۔ مگر ان سب کے باوجود لگتا کہ صرف لب ہی ہے کہ انہی کے راستے ان میں اتروں۔ آرزومندی نہایت دلفریب پیرائے میں کرتا نظر آتا ہے۔

کبھی کبھار ایسی حالت بھی درپیش آجاتی ہے کہ جو محسوس ہوتا اس کا بیان دشوار لگتا اور نہایت سست روی کا شکار ہوں جیسے۔ یہ احساسات کسی کی سمجھ میں آنا ممکن نہیں اور یہ تنہائی جو کہ دیکھنے میں تنہائی ہے مگر ایک وسعت ہے۔ جس کی کوئی حد نہیں سب اس میں قید نظر آتے ہیں۔

عجب اک بے نیازی سی مرے حصے میں آئی ہے

سارا جہاں اس میں مقید ہے!(۹۱)

یہ وسعت کسی بھی چیز کی ہو سکتی ہے جو دکھنے میں تنہائی محسوس ہوتی مگر اس میں بھی بے تحاشا عوامل حائل ہے۔ خوشی، غم، دکھ سکھ، معاشی، معاشرتی اور ذاتِ انسانی سے منسلک تمام عوامل کا اظہار اس کا مجموعہ کلام ہے۔ وہی ملک و قوم کی بیداری، ترقی و خوشحالی اور زبوں حالی کا بیان بھی۔ یہ مجموعہ اس کے نام سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ اس میں شاعر کیا بیان کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ شاعری کو سنجیدگی سے لیتے نہ لطف لینے کے طور پر۔ ہمیشہ مقدار پر معیار کو ترجیح دیتے۔

ساتھ ساتھ اس میں ان کے اس صورت حال کا ذکر بھی ملتا ہے۔ جس سے اس وقت پاکستان گزر رہا تھا۔ سیاسی وسماجی موضوعات کا علاوہ اس میں مذہبی موضوعات اور خدا سے ایک نئے تعلق کا آغاز ان سب کو موضوع سخن بنایا۔

زمین کو چلتے چلتے اک زمانہ ہو گیا

وہ تھک چکی ہو گی!

وہ لمحہ آ چکا ہو گا کہ جس میں نیند کی یلغار ہوتی ہے
کوئی بھی آنکھ پھر مشکل سے ہی بیدار ہوتی ہے
کرن تلوار ہوتی ہے[۹۲]

اپنے عہد کے مسائل کو شاعری بنانا کارِ دشوار ہے۔ جہاں پر قدرتِ کلام ہی کا کام نہیں بلکہ شاعر نے ان مسائل کو اتنی شدت سے محسوس کیا ہو کہ وہ اس کا ذاتی بن گیا ہو۔

ذاتی کشمکش کا شکار بھی نظر آتے ہیں۔ خود کی دنیا بنانے اس میں خود ہی رہنے اور ساتھ ہی دوسرے عزیز چاہنے والے بھی کہیں موجود ہے اور جن سے ہر دن ملتا ہوں کون ہے یہ کہ رستوں کے ہوتے ہوئے بھی اکیلا پن اور کچھ ان کے دل خراش رویے برتاؤ جو ایک انسان کو دوسرے انسان دوری پر آمادہ کرتے ہیں۔ اس کو پیش کرنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ ایک مجموعے کی بیشتر نظمیں نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔ شہزاد احمد کی فکر کا دھارا کہیں ایک جگہ رک نہیں رہا بلکہ یوں محسوس ہوتا کہ جسے اپنے عہد کے سیاسی وسماجی، معاشی و معاشرتی حالات و واقعات سے گزرنا پڑا۔ اور ان کو خود میں جذب کر کے تو نظم کی صورت ہم تک پہچانے کی کوشش کی گئی ہو۔

کوئی ایسا نہیں
میں جسے اپنا یہ دکھ بتاؤں
تو مجھ سے کہے۔۔۔ ”میں تمہیں جانتا ہوں“
کون ہوں میں ؟ کہاں ہوں !
یہ ہر لحظہ تبدیل ہوتی ہوتی زندگی
مجھ سے کیا چاہتی[۹۳]

پہلے پہل آج کے دور سے پہلے انسان اس دورِ ناگوار سے بہتر تو جنگلوں میں بہتر زندگی بسر کرتا تھا۔ ترقی یہاں ہوئی وہی انسانی قدریں پامالی کا شکار ہو گئی۔ تب سب اپنا اپنا تھا۔ اب تو اپنا سب کچھ ہوتے ہوئے بھی دوسرے کا چھیننے کے در پہ ہے۔ پہلے چاہے کم تھا مگر اپنا تھا کم یا زیادہ تھا۔ اسی پر قناعت کرتے۔ اس دنیا کی ترقی نے انسان میں انسانیت نام کی کوئی چیز نہیں رہنے دی۔ کچھ نہ ہوتے بھی یہ احساس تھا کہ جو ہے جتنا ہے اپنا ہے۔

مقصدِ تخلیق کا بھی ان کے ہاں نظموں میں یہ موضوع پایا جاتا ہے۔ کس مقصد کے لیے کیوں پیدا ہوا ہوں، کون اور کس لیے ہوں میں یہ کائنات میں پیدا ہونے والی چیز یہ کن مقاصد کے تحت وجود میں آئے۔

آخر اس سب کا مقصد مرے مرنے سے پہلے کاش مجھ پر عیاں ہو جائے۔ مقررہ وقت پر زمین، چاند، سورج، رات، دن کا مقررہ وقت پر آنا جانا۔ آخر یہ سب کیوں کس مقصد کے لیے۔ اس جہان میں تو ہر طرح کی مصیبت و ملامت اور ناگوار حالات وواقعات کا سامنا کرتا ہوا اور سورج جو کہ یوں محسوس ہوتا جیسے آگ برسا رہا ہو۔ اس سب کو عمدگی سے پیش کیا گیا۔

"اس مجموعے میں آشوبِ ذات کے اشارے بھی ہیں اور ملک و ملت کے تخصیص کے ساتھ دنیا بھر کے سلگتے مسائل کا احاطہ کرتے ہوئے آشوبِ عصر کا بیان بھی تاہم اس کی شناخت کا بنیادی حوالہ آشوبِ آگہی ہے۔"[۹۴]

دل جس کو رب نے اتنی وسعت کا حامل بنایا ہے۔ نہ کہ بھرتا ہے یہ نہ ہی کوئی اس ذات کے علاوہ جاننے والا نہ جان سکا۔ شہزاد احمد کی ہر مجموعے کی ہر نظم کوئی نہ کوئی فکر اور غور و خوض کی جہت دکھائی دیتی ہے۔ شہزاد احمد کے ہاں غور و فکر کی شعاعیں نکلتی نظر آتی ہے۔ وہ کائنات زندگی اور انسان اور روح کے بارے میں سوالات کر دکھائی دیتے ہیں۔

میرا لہو تا آج اخبار ہے

جسے جو ملا وہ کھا گیا[۹۵]

شہزاد احمد کی نظموں میں ذاتی قلبی واردات، مذہبی احساسات، تصوف، حزن و ملال اور حسن و محبت کے مضامین، فطرت نگاری اور فلسفیانہ انداز بیاں اور کائنات کے تمام موضوعات کا بیان اور ہر مجموعہ اپنے نام کی طرح اپنے اندر بے کراں ان گنت موضوع سخن بیان کیے ہوئے اور ہر مجموعہ اپنے دور کے سماجی، سیاسی، معاشرتی حالات کی ترجمانی کرتا نظر آتا ہے اور اس ہر دور میں ہونے والے حالات وواقعات، جذبات و احساسات، ایثار، رحم دلی، اخلاق زاویے اور وارداتِ قلبی کا بیان ملتا ہے۔ وہ چاہے سائنسی، فکری و فنی اور محبت کی زبان میں بیان کیے ہوئے نظر آتے ہیں۔

فکری سطح پر شہزاد احمد کے ہاں اگرچہ پرانے موضوعات کثرت سے موجود ہیں مگر انہوں نے موضوعات کو نئے قالب میں ڈھالنے کا جتن بھی کیا۔ انہوں نے موضوعات کو ایک ایسی طرز اور زبان دی کہ عہد حاضر کی حسیت کے اظہار کی ذمہ داری اٹھانے کے قابل نظر آتے ہیں۔ ان فکری پیمانوں کو انہوں نے اپنے باطن سے پھوٹنے والے استفہام کے ساتھ آمیز کر کے جدید موضوعات بھی تراشے جو اس معاشرے کے انسانوں کے بنیادی مسائل ہیں۔ جہاں انسان دو

مسئلے سے دوچار نہیں بلکہ مسائل کی آماج گاہ بن چکا ہے۔ جب مسائل معاشرے کے اتنے ہو تو معاشرے میں کوئی شاعر کسی ایک مسئلہ، فکر ایک کیسے ہو سکتی ہے۔

"فکری سطح پر شہزاد احمد کا بھی کوئی ایک مسئلہ یا موضوع نہیں ہے۔ بلکہ وہ بہت سارے اسرار و رموز کی کھوج میں مضطرب دکھائی دیتے ہیں۔ مرتے دم تک وہ جمود کا شکار نہیں ہوئے بلکہ فکری حوالے سے بہت تر و تازہ اور جوان رہے۔"(۹۶)

اپنے فکری سفر میں وہ کہیں بھی خاموش نہیں ہے بلکہ وہ تو پیچیدہ سے پیچیدہ موڑ سے بے خوف و خطر گزر رہے۔ نقش پا سے تجسس و استفہام کے دیے جلا رہے ہیں۔ شہزاد احمد کے موضوعات و فکر تنوع انگلی اٹھا کر گواہی دے رہے ہیں کہ ہماری تخلیق کا ہنر شہزاد احمد کے پاس ہے۔ ان کے موضوعات اور انوکھی فکر میں انفرادیت اور فن کاری کے نئے امکان پوشیدہ ہیں۔

"شہزاد احمد کی فکری تربیت کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ وہ صاحب مطالعہ تھے بلکہ کثیر المطالعہ تھے۔"(۹۷)

متجسس لوگوں کے لیے کائنات ہمیشہ سے ایک معمہ بنی رہی اور لوگ جس کی تسخیر اور جس کے رازوں کی دریافت میں ہمہ وقت سرگرداں رہے۔ تلاش و جستجو کا رجحان انسان کی سرشت میں شامل ہے۔ جس کے باعث وہ نت نئی کامیابیوں کی منازل طے کر پاتا ہے۔ اس رجحان کو شہزاد احمد نے کس طرح محسوس کیا اور پھر اپنے تجزیے کا حصہ بنایا۔ ویسے تو شہزاد احمد کی پوری زندگی ہمت و حوصلہ مندی کا درس ہے۔ تمام عمر مسائل سے برسرِپیکار رہے اور شاعری میں بھی اسی بات کا درس دیتے کہ چپ کر کے بیٹھ جانے سے بہتر مسائل کا حل نکالا جائے۔

ہر سمت سے سیل بلا
پھیلا ہوا بپھرا ہوا
میری طرف آنے لگا
میری امیدوں کے دیے
شاید ہمیشہ کے لیے
مدھم ہوئے اور بجھ گئے

ایسا نظر آیا مجھے
جیسے مرے چاروں طرف
کچھ بھی نہیں کچھ بھی نہیں(۹۸)

(ایک لمحہ، ص۶۵۱)

شہزاد احمد اخلاقی اور معاشرتی مسائل اور سطح پر لوگوں کے بہت سے دکھوں کے محسوس کرنے کے بعد انسان کے اندر منافقت، بے وفائی اور بے مروتی کو بھی شدت سے محسوس کرتے نظر آتے۔ ہر شخص نے دوہرا معیار زندگی اپنا رکھا ہے۔ ظاہر و باطن میں تضاد ہے۔ جھوٹ، دھوکہ عام ہے۔ ان سب کا بیان فکری پہلوؤں سے کرتے نظر آتے ہیں اور خود کی محرومیوں سے دوچار ہوتے ہوئے کہیں نہ کہیں لڑتے نظر آتے اور عجیب دلکش فکری پیرائے میں اظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

اب کہا چاندنی کی نرم دھنیں
آؤ محرومیوں کے خواب بنیں
چپ ہے تاروں کی انجمن ساری
آج یہ چاند رات ہے بھاری
بجھ گئے ہیں تمام نظارے
اجنبی اجنبی ہیں سیارے
غیر مانوس ہے فضائے جہاں(۹۹)

(کل بھی اک رات آنے والی ہے، ص۸۵۲)

شہزاد احمد کے ہاں معاشرے کا تہذیبی سطح پر زوال بڑھتے شہروں کی وجہ سے ہے۔ شہروں کے باسیوں کے اندر دوغلا پن، حوس، ریاکاری، مادیت پرستی کا رجحان زیادہ ہوتا جارہا۔ وہ اجنبیت، بے معنی اور تنہائی جس سب کا ذکر ان کی نظموں کا منبع ہے۔

مٹ گئے سلسلے امیدوں کے
کیا یہی ہیں صلے امیدوں کے؟
ہم نے راحت کی جستجو کی تھی

ہم نے جینے کی آرزو کی تھی
خواہشوں کے دیے جلائے تھے
ہم نے کتنے محل بنائے تھے
لٹ گئی ہے مگر بھری محفل
رہ سکیں ریت کے محل! مشکل
آنکھ پتھرا گئی ہے جیتے جی
زندگی اک وبال سا کچھ ہے
صبح ہونا محال سا کچھ ہے
کسی صورت یہ شب گزر جائے
یا الٰہی سحر نظر آئے
ٹوٹ جائے یہ سلسلہ غم کا
رنگ نکھرے تمام عالم کا(۱۰۰)

شہزاد احمد کے ہاں جہاں انسانی نفسیات کی مختلف کیفیتوں کا اظہار ہے وہاں وہ دیگر سماجی مسائل کے بارے میں بھی گہرا شعور رکھتے ہیں۔ داخلی و خارجی انتشار کے ساتھ ان کا تعلق خدا کے ساتھ بھی مضبوط ہے جو کہ ہارٹ اٹیک کے بعد ممکن ہو پایا۔

ہندوستانی مسلمان انگریزوں اور ہندوؤں کی چیرہ دستیوں کو ایک عرصے سے برداشت کرے ہوئے محکوی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ایسی صورت حال میں آزادی کا تصور ایک جانفزا خواب تھا۔ شہزاد احمد کی نظموں میں آزادی کا تصور بھی پایا جاتا ہے۔

تم سمجھتے تھے کہ ہے نیند میں دنیا ساری
اور تم دیکھتے تھے جاگتی آنکھوں سے وہ خواب
جن کا انجام تباہی تھا، تباہی کے سوا کچھ نہ تھا
تم تباہی کے خریدار تھے بیوپاری تھے
اور حق بات سے انکاری تھے(۱۰۱)

رومانیت کے ساتھ ساتھ فلسفیانہ فکری پہلوؤں کو بھی پروان چڑھایا اور اس میں بیان کرتے نظر آتے۔ شہزاد احمد رومانوی مدار سے نکل کر حقیقت کی طرف راغب ہوئے اور ان کی شاعری میں یعنی کہ نظموں میں موضوعاتی سطح پر پیش رفت نمایاں ہونے لگتی۔ وہ باطن کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب کر فکر کے جو موتی پیش کر رہے تھے ان کی چمک دمک بالکل واضح تھی۔ اسی دور میں وہ فلسفیانہ فکر و عوامل، تشکیک، مزاحمت، تلاشِ معنی، نفسیاتی اسرار و رموز، ماحول کی حول ناکی اور یادِ رفتگاں جیسے سنجیدہ نوعیت کے موضوعات کی فکر بنت کاری میں مصروف نظر آتے ہیں۔

"مسلسل تجربات سے گزر رہے تھے۔ کبھی آزاد نظم کے سفر میں تو کبھی نثری نظم کے سفر میں، کبھی انشائیے کے سفر پر تو کبھی مترجم کے رو میں نظر آتے ہیں۔"(۱۰۲)

شہزاد احمد کے ہاں انسانی نفسیات کے بھرپور شعری نمونے ملتے ہیں۔ انہوں نے مختلف کیفیات کو ذہن سے جھٹکنے کی بجائے ان میں نفسیاتی سطح پر جاذبیت پیدا کی۔ ان کیفیات کو علمی و ادبی بنایا۔

میں تیرا اثبات کر رہا تھا
اور اپنا انکار کر رہا تھا
میں چاہتا تھا کہ تیری خاطر
تمام دنیا کو چھوڑ دوں میں
مگر یہ دنیا عجیب شے ہے
یہ جو بھی جھولی میں ڈالتی ہے
فریب ہوتا ہے!
چند لمحوں میں اپنی صورت بگاڑ لیتا ہے
میری جھولی ازل سے خالی ہے
اور ابد تک یونہی رہے گی
میں تیرا انکار کر رہا ہوں
مگر ایک ٹوٹا ہوا زرد پتا
پرانے درختوں کے سوکھے ہوئے۔۔۔ سلوٹوں سے بھرے جسم سے۔۔۔
یوں ہم آغوش ہے۔۔۔ جیسے آتا ہوا وقت اس کے لیے حادثہ ہو

شاخ سے ٹوٹنا حادثہ تھا

مگر ان پرانے درختوں کے سوکھے ہوئے جسم سے دوریوں کا تصور

پھر اک شے سے بڑھ کر المناک ہے [(۱۰۳)]

شہزاد احمد نے خارجی و داخلی وارداتِ قلب کا بیان اور انسان کی ان گنت نامکمل خواہشات کا ذکر بھی کرتے ملتے ہیں۔ جہاں ہو وہی رہو۔ یہ دنیا جو شور سے بھری پڑی ہے جس میں کچھ سنائی نہیں دیتا۔ ہر طرف میں کی پڑی ہے۔

کہاں جانے کی خواہش کر رہے ہو

جہاں ہو تم، وہیں بیٹھے رہو

تمہیں جو دیکھنا ہے

اپنے گھر کی بند کھڑکی سے کسی شیشے سے دیکھو

اگر کھڑکی کھلی

تو صرف آوازیں نہیں

اس شہر کا شور بھی کمرے میں آئے گا

جسے تم سن نہ پاؤ گے

فقط حیران رہ جاؤ گے

سوچو گے

یہ دنیا کس طرح کی ہے [(۱۰۴)]

(کہاں جانے کی خواہش کر رہے ہو، ص ۱۲۱)

شہزاد احمد کے ہاں کربِ ذات کا تنہائی کا احساس بڑا ہنگامہ خیز ہے۔ جہاں سناٹے چیختے خاموشیاں طوفان اٹھاتی ہے اور اس طوفان میں پیش آنے والے ہیولے جو کہ جیسے اس سب کے بعد بھی کائنات تو صرف ایک ذرے کی مانند لگتی تناسب ہوتے ہوئے بھی۔

یوں لگے جیسے کائنات تمام

ایک ذرے میں آ سمائی ہو

کیسا بے رنگ ہے یہ سارا جہاں

کوئی تصویر ہے نہ کوئی نشاں

ایک معدومیت سی ہے رقصاں

وسعتیں بے کنار، بے پایاں

اے مرے دل تو آبسا ہے کہاں![۱۰۵]

(دل کوئی بے چراغ گھر تو نہیں، ص ۱۲۷)

شہزاد احمد کی فکر اور نظمیں عام ڈگر سے ہٹ کر معلوم ہوتی ہیں اور ہر موضوع سخن کو عملی جامہ نظموں کی شکل میں پہنا کر ڈھل کر سامنے آتی ہے۔ آپ نے خصوصاً فلسفہ اور نفسیات کے علوم کی روشنی سے اپنی نظموں میں کائنات کے سربستہ رازوں سے پردہ اٹھانے کی کاوش کی ہے۔

شہزاد احمد نے نظمیں کہیں اور یہ نظمیں ان کی غزل کے ایک ایک شعر کی نشریات محسوس ہوتی ہیں۔ ان کی نظمیں جہاں انسانی نفسیات کی بوقلمونی سے آراستہ ہے وہیں ان کا معیار بھی شہزاد کی غزل کی طرح صاف ستھرا اور بلند ہے۔

جوں جوں آگاہی حاصل ہوتی ہے

لگتا ہے کہ یہ پاتال بہت ہی بڑا ہے

بامِ فلک سے لے کر

نچلی ساتویں دنیا تک پھیلا ہے

لیکن یہ سارا پھیلا ہے

میرے دل کے اندر ہے[۱۰۶]

(استدلال، ص۱۳۹)

دنیا جو کہ منڈی نما ہے۔ سب اپنے فائدے کے لیے سرگرداں۔ خود کی محنت پر یہ مصنوعی چیزوں کو فوقیت دیتے۔ ہر کوئی منافع کی فکر میں ہے۔ پھر خود کا کیا دوسروں پر ڈال کر بری الزماں ہو جاتا ہے آدمی۔

نہایت سادہ الفاظ کی بنت کے ساتھ شاعر نے اس کو بیان کیا:

یہ بھی صورتِ حال عجب ہے

بندی خانے کے اندر ہم خود کو آزاد سمجھتے ہیں

آزادی کے جشن مناتے ہیں

اور اندر سے روز ہی ٹوٹتے جاتے ہیں![۱۰۷]

(بکنے والی چیزیں، ص ۱۴۱)

خود کائنات کو جانچنے، پرکھنے، عمیق مطالعہ کرنے کے بعد سب اٹھنے والے اور اندر سے جنم لینے والے سوالوں کے جوابات سے عاری نظر آتا ہے شاعر۔ اور دوسروں سے مخاطب ہوتا نظر آرہا ہے۔ نظم تم کیا کہتے ہو؟ اس سب کا فکری تنوع سے بیان کرتا نظر آتا۔

اے خدا ہم کو یہ تو حق دے
کہ اپنی مرضی سے فیصلہ کچھ تو کر سکیں ہم
ہمارا انجام کس طرح ہو!
ہر ایک مجرم کو پھانسی دینے سے پہلے
اتنا تو پوچھتے ہیں
''تمہاری باقی ہے کوئی خواہش''
تو ہم کہیں گے
زمین کے ساتھ آخرت کو بھی ختم کر دے[۱۰۸]

(لرزتا ہوا ستارہ، ص ۱۴۵)

شہزاد احمد کے ہاں عالمِ حاضر سے لے کر عالمِ غیب تک فکر و شعوری ادراک موجود ہے۔ اسی ادراک کے حصول کو ''آگہی'' کا نام دیا جاتا۔ شہزاد احمد کو اس آگہی نے تمام عمر مضطرب رکھا ہے۔ انھوں نے جس چیز کو جان لیا اس پر بھی بے چین رہے کہ اس کا اظہار کسی نہ کسی طرح کر دیا جائے اور جس چیز کو نہ جان سکے ان کے جاننے کے شوق میں مبتلا و بے چین رہے۔

اے جہانوں، اے زمانوں کو بنانے والے رب!
تو نے یہ سوچا تھا کب؟
اتنی وسعت اتنی پنہائی بنائی کس لیے؟
اس اندھیرے کے لیے کافی تھی
سورج کے دیے کی روشنی[۱۰۹]

(ہونے کی ضرورت، ص ۱۶۴)

شہزاد احمد کی زندگی جستجو و تجسس کا مرقع وہ اپنی ذات کے مقید حوالوں سے نکل کر کائنات کے اسرار و رموز جاننے کی کوشش کرتے ہیں اور فلکیات کے نظام میں ان کی خاص دلچسپی ہے۔ وہ دنیا کی حقیقتوں اور سچائیوں کو جاننے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ ان سب کا احاطے کیے نظر آتے ہیں نظموں کی صورت میں۔

شہزاد احمد کی شاعری متنوع موضوعات میں ڈھلی ہوئی ہے۔ سماجی، سیاسی، تہذیب اور ثقافتی معاملات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ روایات کی پامالی اور اقتدار کی بے حرمتی ان کو خون کے آنسو رلاتی ہے۔ وہ انسانیت کو سب سے بڑا مذہب سمجھتے ہے اپنی روایات و اقتدار کو زندہ دیکھنا چاہتے۔ ہر انسان کا دکھ اپنا لگتا انہیں۔ اور ان کی نظموں میں بھی یہی دکھ اور تڑپ نظر آتی۔ ان کی نظمیں جذبے کی شرینی میں گندھی ہوئی فکری بالیدگی کا اظہار ہے۔ اور شعور ذات، شعور عصر، اور شعور کائنات کے اس سفر میں وہ قدم جما کر چل رہا ہے۔ شکست و ریخت کا یہ عمل انہیں ٹکڑے کرتا ہے۔ شہر آشوب کی اس کیفیت کو انہوں نے اپنی بہت سی نظموں میں پیش کیا۔ ان کے ہاں اسلوب سے زیادہ سے زیادہ خیال کی اہمیت زیادہ ہے۔

ہر ایک شے سے بڑھ کر المناک ہے
پرانے درخت اک زمانے سے مٹی میں پاؤں پسارے ہوئے ہیں
انھوں نے جہاں آتے جاتے ہزاروں موسم گزارے ہوئے ہیں
ہزاروں ہی دن اور ہزاروں ہی راتیں
انھیں ایک جھونکے کی مانند محسوس ہوتی ہیں
جو اپنی ہی خوشبو سے مدہوش ہو
انہوں نے کئی زرد پتوں کا انجام دیکھا ہے
اور منتظر ہیں کہ یہ آخری زرد پتا پرانے درختوں کا انجام دیکھے (۱۱۰)

(آشوب، ص ۹۲۷)

ان کی نظموں کے ہاں فکر واضح نظر آتی ہے۔ غموں کا اظہار دکھائی دیتے۔

اور غم کے اجڑنے ہوئے روکھے زرد پتوں کی مانند
کہ سورج کی پہلی شعاعیں۔۔۔۔کسے کون سے رنگ میں دیکھ پائیں
پرانے درختوں سے چمٹے ہوئے زرد پتے کہاں خاک اُڑائیں

خدا جانے وہ لمحہ کب آئے۔۔۔۔۔۔۔۔جو آخری ہو[۱۱۱]

(آشوب، ص۹۳ ۷)

اس انداز سے الفاظ کا چناؤ کرتے جس سے خیال کی لو روشن ہو جاتی۔شاعری سادگی و دلکشی کا حسین امتزاج ہے۔کارزار حیات میں طبقاتی تقسیم، اخلاقی اقتدار کی کمی، مادیت پرستی، سماج کی کشمکش شاعر کو افسردہ کرتی ہے۔مادیت پرستی کے عفریت نے تقوی اخلاص، صدق و امانت اور سادگی و حسن عمل کو نگل لیاہے۔انسان نے اپنی ذمہ داریوں اور فرائض سے فرار کا راستہ اپنایا۔دام ہوس اور روایات کی شکست و ریخت میں انسانیت تڑپ سسک رہی ہے۔محبت و ایثار کے جذبے بے معنی و بے وقعت ہو کر رہ گئے ہیں۔مال و زر کی طمع، اقتدار کی پرستش نے انسانیت کو حقیقی مسرت و راحت محروم کر دیا۔جب کے شاعر انسان دوستی، محبت اور عوام سے گہری وابستگی رکھتے۔اس لیے زر کے سانچوں میں ڈھلی زندگی جن حوادث کی زد میں ہیں وہ آج انسانیت درد و آلام کی زد میں ہے۔شہزاد احمد کی نظموں میں فکری لحاظ سے تنوع دیکھنے کو ملتاہے جن میں سیاست بھی، اور محبت بھی، معاشرت بھی ہے، معشیت بھی اور مذہب بھی ہے۔اور روایات بھی۔انہوں نے زندگی کے تمام رنگوں کو خوبصورتی اور توازن کے ساتھ پیش کیا۔

شاعر کے ہاں زندگی کی معنویت بھی ایک منفرد انداز کے ساتھ نمایاں دکھائی دیتی ہے۔خود آگہی کا درس دیتے ہوئے نظر آتے۔ان کی نظموں کے مطالعہ سے بخوبی اندازہ ہوتاہے کہ فنی اظہار سے زیادہ ان کی فکری پہلوؤں کو زیادہ جامع انداز سے بیان کرتے دکھائی دیتے۔

باطنی کیفیات کا اظہار سفاک حقیقت نگاری سے کرتے۔ان کی نظمیں باطنی سچائی کی مظہر ہے۔وطن سے محبت ان کے ضمیر میں ہے۔اور اس کا اظہار بے اختیار عمل ہے۔ان کی نظموں میں سماجی سطح پر انسانی رویوں کا دوغلا پن، منافقت، تہذیبی، انتشار، معاشی ناہمواری سے جنم لینے والے سانحات اور کئی ایسے پہلو پر ملے جلے احساس نے انہیں بہ حیثیت شاعر ایک دانش ورانہ جو حقائق زندگی کے طور پر دکھائی دیتے ان کی نظموں میں حساس انسان کا شعور نظر آتا ہے۔شعور اور عقل زندگی کی علامت ہیں۔ان کی مدد سے ہی زندگی کو بامقصد بنایا جا زندگی ہے اور بے مقصد جینا موت کے مترادف ہے۔جب آپ کے شعور سے آپ میں وہ فکر سوچ اور خیال پیدا ہو جس سے آپ زندگی میں مثبت قدم اٹھا سکتے تب ہی آپ ایک بہترین زندگی گزار سکتے۔نہ صرف خود کی زندگی کو بلکہ دوسروں کی زندگی کو بھی بہتر بنا سکتے ہیں۔اور ہمارے تمام شعرا اپنی شاعری کے ذریعے عوام الناس میں اسی شعور و عقل کو بیدار کرنا چاہتے ہیں۔اور ہمارے قومی شاعر اقبال رحمتہ کے نزدیک فکر کو ہمیشہ بلند رکھنا چاہیے فکر کی بلندی ہی انسان کی کامیابی ہے۔اقبال رحمتہ اور

دوسرے شعرا کی طرح شاعر بھی اس بات کو اپنا فرض سمجھتے ہوئے وہ اپنی شاعری کے ذریعے عوام میں اس شعور کو کرے تو انھیں ترقی کی راہ پر لے جائے۔ اور کبھی س جہان سے پرے اور جہان کی بھی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

طنابِ وقت کٹ چکے تو خیمہ فلک گرے
پتہ چلے کہ کون سے
جہاں ہیں میری آنکھ سے چُھپے ہوئے
ستارے خیمہ فلک کی روزنیں
کہ جن سے آرہی ہے چَھن کے روشنی
چُھپے ہوئے جہان کی
مجھے بتارہے ہیں یہ ستارے
دیکھ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ آسماں سے دُور
اک جہاں نہیں، کئی جہان ہیں
جن میں روشنی ہے رنگ ہے (۱۱۲)

(جہانِ دور، ص۸۰۳)

فکری گہرائی ہر شاعر کے اندر ہوتی ہے۔ اور اسی گہرائی کو محسوس کرنے کے بعد شاعر لفظوں کا جامہ پہنا کر نظم کی صورت ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔لہذا تنہائی بہت سے شعراء کا مقدر بنی۔ شعرا حضرات نے اس پر بہت لکھا۔ اور اب ان لکھنے والوں میں شہزاد احمد کا نام بھی شامل ہے۔ جنہوں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا۔ عاشق محبوب کو تنہائی میں سوچتا تو ہے۔ اسے ہر طرف وہی دکھائی دیتا ہے۔ اس کے دلوں دماغ پر ایک عجیب کیفیت کا رنگ چھا جاتا ہے۔ شہزاد احمد کے ہاں تنہائی دیگر زمروں میں بھی موضوع سخن بنتی دکھائی دیتی ہے۔

سانولی! مُجھ تِری آنکھوں نے
وہ فسانے بھی سنائے کی جنھیں
کہنا چاہیں تو ترے ہونٹ فقط "جی" کہہ کر
اور افسانوں کو دہرانے لگیں
یا تُو بیگانوں کی مانند مرے پاس سے گزرے
تو کبھی ـــــ

میری طرف دیکھ کے چلنا بھی گوارانہ کرے
لیکن آنکھوں میں چمک آجائے[۱۱۳]

(اَن کہی، ص۶۱۸)

شہزاد احمد کے ہاں نظموں میں خودداری اور عزت نفس کا گہرا شعور بھی موجود ہے۔اور اس امید اور آس کے ہوتے بھی عزت نفس کو مجروح نہیں ہونے دیتے۔اور عزت نفس کو قائم رکھنے کی تلقین کرتے دکھائی دیتے۔وہی پر کبھی خود سے انکاری ہوتے ہوئے دیکھائی دیتے ہے۔ نظمیں عنوان سے ظاہر کرتی ہے کہ شاعر نے جیسے کل کا احاطہ کیا ہو۔عام سے موضوعات کو فکری ڈھانچے میں ڈھالتے اور عام سادہ لفظوں کے چناؤ سے خود کے اظہار کو اور بھی سلیس بنا دیتے۔

سمجھ میں یہ نہیں آتا!
خدا نے اِتنی وسعت میرے دل کو کیوں عطا کی تھی
نہ بھر سکتا ہوں اِس کو میں
نہ اِس کو جان سکتا ہوں[۱۱۴]

(یہ خواہش، ص۱۳۸)

شہزاد احمد کے ہاں خواہشات کا اظہار متنوع انداز سے نظر آتا ہے۔ خواہش کا کامطلب آرزو، طلب کے ہے۔اور اقبال کے نزدیک ہر دل میں خواہش کا پیدا ہونا زندگی کی علامت ہے وہ دل مردہ جس دل کے اندر خواہش نہ ہو۔ شہزاد احمد کے ہاں ان کی نظموں میں اپنی کچھ ادھوری خواہشات کا ذکر کرتے ہے۔اور یہ بات تو ثبت ہے کہ مقصد کوئی بھی ہو حصول منزل کی خواہش بہت شدت سے پیدا ہوتی۔شاعر بھی کچھ ایسی ہی کیفیت سے دوچار ہے۔

عجب اک بے نیازی سے مرے حصے میں آئی ہے
میں جو محسوس کرتا ہوں
اسے کہنے کی خواہش ہی نہیں رکھتا مجھے اندازہ ہے
میں جس طرح محسوس کرتا ہوں
اسے میں ہی سمجھ سکتا ہوں
میں ہی مان سکتا ہوں[۱۱۵]

(ایک وسعت، ص۱۱۳)

مقصد حیات کو پورا کرنا چاہتے ہیں۔ مگر منزل سے بے خبری نے ان کے اندر کیا خواہش پیدا کی وہ یہ نظم اس کی مثال ہے۔

شاعر کے ہاں کہی پر محبت کے جذبات اور محبوب کے آنے کی خواہش لیے دل میں نظر آتا ہے۔ تو اس خواہش کا اظہار کرتے کہ محبوب سے بات چیت، روبرو ہمکلام ہونے کی خواہش واضح نظر آتی۔ کبھی اس کی طلب تو کبھی خود کی محبت محبوب کے لیے اس کا بیان۔ دونوں گھلے ملے دکھائی دیتے ہیں۔

وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں گی!

مگر کہتی نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

وہ مجھ سے کچھ سننا چاہتی ہو گی

مگر سنتی نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔[۱۱۶]

(وہ مجھ سے کچھ تو کہنا چاہتی ہو گی، ص۱۱۱)

وہی پر خود کی محبت جو محبوب کے لیے احساسات اور محبوب کی بے رخی کا بیان ملتا ہے۔

مجھے لگتا ہے اس کے پاس آنکھیں ہی نہیں ہیں

اگر ہوں بھی تو ان کا فائدہ کیا ہے!

وہ دیکھے تو سہی

میں اس کی جانب کس محبت سے نظر کرتا ہوں[۱۱۷]

(وہ مجھ سے کچھ تو کہنا چاہتی ہو گی، ص۱۱۱)

مایوسی اور ناامیدی دو ایسے احساسات جو زندگی کو بے رونق بنا دیتے ہے۔ ایک شاعر جو زندگی میں جڑ کر ٹوٹنے کے عمل سے بارہا گزرتا ہے۔ تو پھر اس کی زندگی میں مایوسی اور ناامیدی گھر کر لیتی۔ ان کا ٹوٹنا بکھرنا ان کی نظموں میں ہاں دکھائی دیتا ہے۔ روز اپنی امیدوں کی عمارت کو پھر سے کھڑا کرتا ہے۔ مگر دکھ کی ہوا کا ذرا سا جھونکا اس عمارت کو زمین بوس کر دیتا ہے۔

میں اپنا انکار کر رہا ہوں

میں یہ نہیں کہہ رہا کہ موجود ہی نہیں ہوں

فقط یہ کہتا ہوں

میرا ہونا، مرا نہ ہونا ہے (۱۱۸)

(میں اپنا انکار کر رہا ہوں، ص ۱۱۹)

اور کبھی ایک وقت ایسا آتا ہے کہ شاعر کو اپنے جیسے انسانوں سے زیادہ فطرت اپنی خیر خواہ لگتی ہے۔ اور جب زمانے کی سختیوں، اپنوں کے دیے دکھوں اور ناانصافیوں سے تنگ آ جاتا ہے تو وہ کسی دوسرے انسان کی بجائے فطرت کو اپنا رازداں بنالیتا ہے۔ اور فطرت کو ہی اپنا غمگسار لگتا ہے۔ اور یوں محسوس ہوتا جیسے شاعر اپنے دل کے احوال فطرت کو سنا رہے ہو۔

شاعری خاص کر نظم اور غزل کہاں عشقیہ مضامین سے مزین شعری انصاف سخن تھی۔ مگر آج دیکھتے دیکھتے ان میں معاشرتی ظلم وستم کی داستانوں نے جگہ لے لی۔ معاشرے کے بڑھتے ہوئے ظلم وستم اور مادیت پرستی، اخلاقی اقتدار کی کمی نے اور ان سب کی انتہا نے تمام شعرا کو اس پر قلم اٹھانے کے لیے مجبور کیا۔ جب معاشرے کے لوگوں میں انسانیت ختم ہو گئی، اور رشتوں کے خون سفید ہو گئے، اپنے اپنوں کے دشمن ہونے لگے اور معاشرے نے جہالت مادیت پرستی کی سیاہ چادر اوڑھ لی تب دوسرے شعراء کیطرح شہزاد احمد کے ہاں بھی یہ موضوع گردش کرنے لگا۔ نا صرف موضوع سخن بنایا بلکہ ان سب کی وجوہات کو بھی بتاتے ہے۔ انسان ہے کہ فانی چیزوں کے پیچھے بھاگ کر اپنی اصل کو کھو رہا ہے۔ اور بے ضمیری کو بھی بیان کرتے نظر آتے ہے۔ "میں انسان نہیں ہوں" ان سب کی عکاس نظر آتی ہے۔

میں انسان نہیں ہوں

صرف ایک باطنی مجبوری ہوں

اپنے اصل سے دوری ہوں

جب میں جنگل میں رہتا تھا میں آزاد تھا

جو کچھ کرنا چاہتا تھا، کرتا تھا

میری ہر خواہش مری اپنی تھی

اکثر میں بھوکا رہتا تھا

کوئی شکار نہ ملتا تھا

پھر بھی مجھے بھروسا تھا
میں اپنی دنیا کا مالک تھا

میرا پیٹ اب بھرا ہوا ہے
سب آسائشیں میرے پاس ہیں
جو بھی چاہو کھا سکتا ہوں
جہاں بھی چاہو جا سکتا ہوں
شہر کو شہر بنانے میں میرا حصہ
لیکن میرے اندر ایک بندی خانہ ہے
جس سے نجات کی کوئی صورت مجھ کو نظر نہیں آتی
میرا باطن ایک ایسا جنگل ہے
جس میں بدروحیں رہتی ہیں
میرے شکار کو کھا جاتی ہیں
اور میں دیکھتا رہ جاتا ہوں
لیکن میرا پیٹ بھرا ہے
توند نکل آئی ہے
سر پر ایک بھی بال نہیں ہے
آنکھیں بھی دھندلا سی گئی ہیں
شور سنائی ہی نہیں دیتا
آئینے میں دیکھ رہا ہوں
اور دکھائی بھی نہیں دیتا(۱۱۹)

(میں انسان نہیں ہوں، ص ۱۲۳)

شہزاد احمد کی نظموں میں سیاسی و سماجی شعور کو اجاگر کرنے کی بھی سعی نظر آتی ہے۔ ہر شاعر اپنے عہد کے سیاسی و سماجی حالات و واقعات اتار چڑھاؤ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح شہزاد احمد بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ

سکے۔ اور اس دور کے حکمرانوں سے نالاں دکھائی دیتے اور اعلیٰ طبقے سے گلہ کہ وہ غریب طبقے کا استحصال کرتے۔ امیروں کے ظلم کرنے اور غریب کے ظلم سہنے پر سوال اٹھاتے۔ اور کہیں پر نوجوان کی بیکار بیٹھے رہنے کی شکایت۔

اپنوں کی لاپرواہی کا دکھ اور مادیت پرستی کا عروج ان سب پر کڑتے نظر آتے ہے۔ اور ان سب کے ساتھ ساتھ اور بہت سے سیاسی وسماجی حالات کے متعلق شاعر کے ذہین میں سوال اٹھتے ہے۔ اور سوال کرتے بھی دیکھائی دیتے ہیں۔ معاشرتی برائیوں کا بیان اور اس پر افسوس کا اظہار بھی کرتے۔ دنیاوی چیزوں میں اتنا اگے جاچکا ہے ک خود ہی ان سب کا سبب اور خود ہی ان سب کا رونا روتا نظر آتا ہے۔

شہزاد احمد کی نظم " بکنے والی چیزیں " اس کی عمدہ مثال ہے:

ہم سب بازاروں میں بکنے والی چیزیں ہیں

ہم اپنی محنت بیچتے ہیں

اور وہ مصنوعی خریدتے ہیں

جن کی ضرورت ہی نہیں ہوتی

یہ دنیا اِک منڈی ہے

جس میں ہر اِک شے پر اس کی قیمت لکھی ہے

یہ قیمت ہم خود ہی مقرر کرتے ہیں

اور خود ہی مہنگائی کا رونا روتے ہیں

چاہتے ہیں ہر بار منافع ہم کو ملے

دوسرے چاہے بھاڑ میں جائیں

یہی رویہ دوسرے لوگوں کا بھی ہوتا ہے

اک دوجے کی کھال اتارنا

وہ مقصد ہے

جسے مسخر کرنا کہتے ہیں

ہم نے جو تسخیر کیا ہے اک اذیت ہے

یہی اذیت مقصد بھی ہے، ذریعہ بھی ہے

اور ہم سب اس کے ہاتھوں میں کھلونا ہیں

یہ بھی صورت حال عجب ہے
بندی خانے کے اندر ہم خود کو آزاد سمجھتے ہیں
آزادی کے جشن مناتے ہیں
اور اندر سے ہی ٹوٹتے جاتے ہیں [۱۲۰]

(بکنے والی چیزیں، ص ۱۴۱)

شہزاد احمد کی نظموں میں یہاں پر محبت کی چاشنی، یاد، تنہائی، معاشرتی معاشی حالات و واقعات کو انتہائی عمدگی سے بیان کرتے ہیں۔ وہی پر ان کے ہاں سوالات کرتے کبھی خود سے تو کبھی فطرت سے کرتے دکھائی دیتے ہے۔ ان کی نظموں میں فانی دنیا کا بیان، اور اس دنیا کی بے ثباتی کا برملا اظہار کرتے دکھائی دیتے ہے۔ تو کہی پر خود کے ہونے کا انکار اور محبوب کی موجودگی کا احساس۔

میں تیرا اثبات کر رہا تھا
اور اپنا انکار کر رہا تھا
میں چاہتا تھا کہ تیری خاطر
تمام دنیا کو چھوڑ دوں میں!
مگر یہ دنیا عجیب شے ہے
یہ جو بھی جولی میں ڈالتی ہے
فریب ہوتا ہے!
چند لمحوں میں اپنی صورت بگاڑ لیتا ہے
یہ میری جھولی ازل سے خالی سی ہے۔
اور ابد تک یونہی رہے گی
میں تیرا انکار کر رہا ہوں [۱۲۱]

(میں تیرا اثبات کر رہا تھا، ص ۱۲۹)

شہزاد احمد کی نظموں میں متنوع موضوعات متنوع انداز میں موضوع سخن بنے۔ ان کی فکر کہیں رو کی ہوئی اور بوجھل محسوس نہیں ہوتی۔ وہی پر ان کی نظموں میں انسان کے اصل اس کے اندرون خانہ یعنی خود کی ذات میں مگن رہنا اور اندر اس قدر اندھیرا کے کچھ سمجھائی ہی نہیں دے رہا۔ اور خوف ہی خوف جو مختلف زاویے لیے ہوئے۔ زمین، سورج اور ستارے دیکھے نہ جانے کتنا عرصہ بیت گیا۔ خود ہی خود کی راہ میں حائل ہوں۔ ان کے ہاں خوف مختلف صورتوں میں دکھائی دیتا ہے۔ کبھی خود سے، کبھی اس مطلب پرست دنیا سے۔ اور اس میں موجود معاشرتی معاشی اور سماجی و اخلاقی اقتدار کی کمی کی وجہ سے خوفزدہ ہوتے نظر آتے ہے۔ ان کی نظم ءءکب،،، اور "مجھے مرنے کی بھی فرصت نہیں ہے" ان سب کی عکاسی کرتی ہے۔

وقت شہزاد احمد کے ہاں رنگ برنگے پیرایوں میں دکھائی دیتا ہے۔ وقت کی قدر کرنا نہایت ہی اہم ہے۔ ورنہ پھر گیا وقت ہاتھ کب آتا ہے۔ وقت بھی ان ہی کا جو اس کی قدر کرتے۔ اسی کا بیان ان کی نظم میں واضح دکھائی دیتا ہے۔

اگر گزرتے ہوئے وقت کی باگ کو تھام لوں!

اور اسے اک قدم بھی اٹھانے نہ دوں

تو پھر رات کیسے ڈھلے گی

دہکتا ہُوا دوزخی آنکھوں والا ستارہ

یہ سورج کہا جائے گا(۱۲۲)

(کاش، ص ۱۶۲)

اور کہی وقت کو تھامنے اور اس کی باگ کو تھامے رکھنے کی کاش کی صورت میں لپٹی ہوئی خواہش دکھائی دیتی ہے اور اجی بھی ان کی نظمیں یوں لگتا اسی عہد کی نمائندگی کرتی ہوئی لگتی ہے۔ ان کی نظمیں اپنے آپ میں کُل کی مانند ہے۔ جو اردو ادب میں اپنی ایک منفرد پہچان بنائے ہوئے ہے۔ جو ان کو بلند مقام و مرتبہ پر فائز کرتی ہیں۔ اور ہمیشہ زندہ رہیں گی۔

ان کی نظموں کے ہاں ایک مخصوص اور قابل مطالعہ فلسفہ محبت ملتا ہے جس طرح بظاہر کنول کے اجالے اور نکھرے رنگ اور تاثر کی وہی مماثل گہری جلد سے نظر اتی ہے لیکن ان کا تعلق بہت گہرا اور مانی خیز ہوتا ہے اس طرح محبت بھی اپنا مواج جس کی کثافت سے حاصل کرتی ہے مگر عید سے محبت کے لطافت میں تبدیل کر لیتی ہے۔ اس نظریے کی بدولت ان کی نظموں میں محبت کی انسانی سطح پائی جاتی ہے۔ جو عین انسانی نفسیات سے مربوط ہے ان کے

مجموعوں میں محبت اپنے تمام جولانیوں سمیت موجود ہے اور مختلف رویہ اختیار کرتی ہے جسے مجموعی انسانیت کی محبت رشتوں کی محبت فتن کی محبت اور سب سے بڑھ کر اللہ اور اس کے رسول سے محبت ان کا خاص رنگ محبت میں ان کے ہاں حسن اور محبت کا موضوع اس رنگ میں بھی موجود ہے۔ جو ہماری شاعری کا خاص امتیاز ٹھہرتی ہے۔ فطری منظر کشی میں بھی شہزاد احمد کا ایک اپنا زاویہ ہے وہ مناظر فطرت کا بیان عجیب و غریب انداز میں کرتے ہیں وہ ایک مخر کی طرح فطرت کے ساتھ ہمکلام ہیں۔ بہار خزاں متنوع انداز میں شاعر کے دل پر اثر انداز ہوتی ہے اب بدلتے موسموں کے اثرات قمیض کے اندر رجائیت کی شکل میں پھوٹتے ہیں کبھی سیاست کے کالک میں فطرت کے زمرے میں ان کی نظموں کا سلسلہ نظر اتا ہے نظم میں وہ رات کے مناظر کے اکاسی کرتے ہیں کہ عظمت اور چاند اور بارش کو بڑے پیارے انداز میں بیان کیا۔ فطرت سے لگاؤ اور شاعری میں اس کے استعمال نے شہزاد احمد کے لہجے اور انداز کو ایک نیا رنگ دیا۔ وہاں کئی مقامات پر ان کی شاعری پر تجریدی مصوری کا ان کی شاعری پر گمان بھی ہوتا ہے۔ وہ جذب احساس اور منظر کو اس طرح گلا ملا کر مہارت سے پیش کرتے تھے اس سے لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ ان کے کلام فطرت کے رنگ تمام تر دل آویزی کے ساتھ موجود ہیں۔ ان کی نظم فطرت کے رنگوں سے مزین ہیں فطرے سے وابستگی کی وجہ سے ان کا مشاہدہ بھی ہے اور مطالعہ بھی وہ جس ماحول میں پلے بڑھے جوان ہوئے اس جگہ کی خوبصورتی جابجا بکھیرے ہوئے مناظر فطرت حقیقی زندگی گرما، سرما، بہار، خزاں سبھی موسم و کرم اپنے تمام تر وظائف کے ساتھ مشاہدہ کیا۔ یہی نہیں بلکہ ان کی نظموں کے ہاں داخلی کرب کل بھی واردات کا اظہار ذات پر مکالمہ کی صورت اور سوال کی صورت نظر اتا ہے یہ کیفیت ان کی کچھ نظموں سے ہمارے سامنے اتی ہے۔ ان کی نظم ذاتی طرز احساس اور خواب و خیال کا عکس بھی پیش کرتی ہیں اصل کمال یہ ہے کہ کہیں بھی خود پسند کی کیفیت نظر نہیں اتی بلکہ حقیقت پسندانہ انداز میں احساسات کے قلبی کا اظہار کر کے وہ اپنی ذمہ داریوں کا بھی احساس کرتے ہیں۔ وہیں پر ان کی نظموں میں وقت کے حوالے سے فکریات کی کرنیں ملتی ہیں ان کے خیال میں وقت ایک طاقت کی علامت ہے وہ کبھی اس کو زندگی میں وقتی طور پر مانتے ہیں کبھی اس کو زمانے لحاظ سے ماضی حال اور مستقبل میں تقسیم کرتے ہیں تہم ان کی نظموں پر وقت سحر کی طرح طاری ہے شیری تخلیق کے لیے ہمیشہ ضرورت نہیں کہ شاید موجودہ وقت سے فرار حاصل کر کے ماضی میں چلے جاتے لیکن شاعری کی فکری اور فنی پختگی اور اس کا طرز احساس اس سے بہر حال ماضی کی طرف جھانکنے اور مستقبل پر نظر ڈالنے پر مجبور کرتا ہے۔ ان کی نظموں میں کسی نہ کسی رنگ میں وقت کا اظہار ملتا ہے گو ما گردش زمانہ کو بڑے ہی حسن انداز میں بیان کرتے ہیں حالات اور وقت ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہتا وقت بدلتا رہتا ہے۔ ان کی نظم میں مخصوص زمانے یا عہد کی تصنیف نہیں

ماضی حال اور مستقبل ہر ایک پر یکساں محیط ہے۔ یہاں روش و فرد ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈالے اس طرح جڑے ہیں کہ بادی و نظر میں کائنات ایک مقوس تسلسل میں گوندی ہوئی نظر اتی ہے۔ شہزاد احمد کی نظموں میں جو کہ جگہ جگہ کائنات اور زندگی کی حقیقتوں کو سمجھنے اور ان کا اعتراف کرنے کی صحیح نظر اتی ہے اور ان کے ہاں فلسفیانہ انداز بیان کا روجان ایک اہم عنصر کی ہے حثیت رکھتا ہے۔ وہ فلکر کو اعلی شاعری کے لیے نہایت ضروری خیال کرتے ہیں عام طور پر شورہ کی اکثریت کا تعلق اس گروہ سے ہوتا ہے جو صرف انسانی جذبات اور احساسات کی ترجمانی کرتے اور کچھ شاعر ایسے بھی ہیں جو دلوں کے ساتھ ساتھ دماغوں کو بھی تقسیم بخشتے ہیں شہزاد احمد بھی ایک ایسے ہی شاعر ہیں انہوں نے اپنے دسوؤں میں نفسیاتی اور فلکری سین کو بہت عروج بخشا انہوں نے کائنات کو فلکر انداز میں دیکھا اور ان پر یہ راز ایا ہوتا کہ کسی بھی بڑی کامرانی اور اعلی مقام تک رسائی کے بغیر نظم وضبط ممکن نہیں۔ وہ مختلف کیفیت کے حوالے سے اظہار خیال کرتے ہیں کہ نظم وضبط ان کی اصل خوبصورتی ہے انسانی رویوں اور عدم تکمیل کے موضوع کو بحث بنایا۔ ان کی نظموں کے ہاں کوئی نہ کوئی فلکر اور غور وخوض کی جہت دکھائی دیتی ہے۔ جس میں وہ خود سے ہم کلام ہوتے ہیں اور اپنی خودی کو سامنے رکھتے ہیں خود ہی معرفت چاہتی ہے کہ میں یہاں ہوں اپنے مقصد زندگی کے بارے میں فلکر مند ہے کیونکہ انسان جب تک معرفت حاصل نہیں کر سکتا اس وقت تک خدا کے معرفت بھی اس کو حاصل نہیں ہوتی۔ ان کے ہاں نظموں میں غور وفلکر کی شعائیں نکلتی نظر اتی ہیں۔ وہ کائنات کو ماز ندگی انسان اور روح کے بارے میں سوالات کرتے دکھائی دیتے ہیں ان کی نظم زندگی پر غور وفلکر کی پیش کش کا عمدہ وسیلہ ہے۔

شاعر کو شاعر اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ نہ صرف ظاہر میں پھیلی زندگی کو کھلی انکھ سے دیکھتا ہے بلکہ اپنے باطن میں اتر کر اس سے کچھ متاعِ خیر نکال کر دوسروں کی نظر کرتا ہے۔ خصوصاریوں کی نظموں میں سماج میں موجود استبدادی قوتیں جو مختلف طریقوں سے انسان پر عرصہ حیات تنگ کرتی ہیں ان کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ اور انسان پر ٹوٹنے والے مسائل کے لحاظ سے، بے مائگی اور ذلت کو محسوس کرتے ہیں اور روح عصر کو شناخت کروانے نے کی کوشش کرتے ہو۔

حوالہ جات

۱. شہزاد احمد، دیوار پہ دستک، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۸ء، ص۶۱۶

۲. ایضاً، ص۶۱۹

۳. ضیاء الحسن، ڈاکٹر، پاکستانی ادب کے معمار: شہزاد احمد شخصیت و فن، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۱۲ء، ص۹۰

۴. شہزاد احمد، دیوار پہ دستک، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۸ء، ص۶۳۱

۵. ایضاً، ص۶۳۳

۶. ایضاً، ص۶۲۶

۷. ایضاً، ص۶۴۱

۸. ایضاً، ص۶۴۰

۹. ایضاً، ص۶۴۷

۱۰. ایضاً، ص۶۴۹

۱۱. ضیاء الحسن، ڈاکٹر، پاکستانی ادب کے معمار، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۱۲ء، ص۹۱

۱۲. شہزاد احمد، دیوار پہ دستک، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۸ء، ص۶۶۷

۱۳. ایضاً، ص۶۷۷

۱۴. ایضاً، ص۶۹۷

۱۵. ایضاً، ص۷۷۲

۱۶. جو زخم سینے پہ لگ چکا ہے، ص۷۷۷

۱۷. ایضاً، ص۷۷۸

۱۸. ایضاً، ص۷۸۱

۱۹. ظالمو یوم حساب آ پہنچا، ص۷۸۸

۲۰. ایضاً، ص۷۸۵

۲۱. ایضاً، ص۷۹۰

۲۲. ایضاً، ص۸۰۵

۲۳. ایضاً، ص۸۲۸

۲۴. ایضاً، ص۸۲۹

۲۵. ایضاً، ص۸۳۹

۲۶. ماورا، ص۸۵۰

۲۷. سہیل احمد، ڈاکٹر، طرفین، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء، ص۹۷

۲۸. شہزاد احمد، دیوار پہ دستک، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء، ص۱۰۰۳

۲۹. ایضاً، ص۱۰۲۷

۳۰. ایضاً، ص۱۰۴۰

۳۱. ایضاً، ص۱۰۴۲

۳۲. ایضاً، ص۱۰۴۱

۳۳. شہزاد احمد، ایک چراغ اور بھی، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، ص۱۸۰

۳۴. ایضاً، ص۱۸۹

۳۵. فوزیہ چودھری، ڈاکٹر، شہزاد احمد کٹھن منزلوں کا شاعر، مشمولہ: وجدان، لاہور: شمارہ۱۸، اپریل۲۰۰۹ء، ص۸۱

۳۶. شہزاد احمد، آنے والا کل، لاہور: ملٹی میڈیا افیرز، ۲۰۰۵ء ص۹

۳۷. ایضاً، ص۱۰

۳۸. ایضاً، ص۱۴

۳۹. ایضاً، ص۱۶

۴۰. ایضاً، ص۱۶

۴۱. ایضاً، ص۱۶

۴۲. ایضاً، ص۱۷

۴۳. ایضاً، ص۱۷

۴۴. ایضاً، ص۱۷۹

۴۵. ایضاً، ص۲۰

۴۶. ایضاً، ص۱۹۳

۴۷. ایضاً، ص۱۹۳

۴۸. ایضاً، ص۱۹۳

۴۹. ایضاً، ص۱۹۴

۵۰. ایضاً، ص۱۹۴

۵۱. ایضاً، ص۱۹۴۔۱۹۵

۵۲. ایضاً، ص۱۹۵

۵۳. ایضاً، ص۱۹۵

۵۴. ایضاً، ص۱۹۵

۵۵. ایضاً، ص۱۹۷

۵۶. ایضاً، ص۱۹۸

۵۷. ایضاً، ص۱۸۷

۵۸. ایضاً، ص۱۸۳

۵۹. ایضاً، ص۱۹۱

۶۰. ایضاً، ص۲۰۲

۶۱. شہزاد احمد، ٹوٹا ہوا پل، ص۱۴۸

۶۲. ایضاً، ص۱۵۴

۶۳. ایضاً، ص۱۵۵

۶۴. مبین مرزا، ساز سخن بہا ایست، مشمولہ: سپوتنک، لاہور: جلد ۱۱، شمارہ جولائی ۲۰۰۰ء، ص۸۴۔۸۳

۶۵. شہزاد احمد، ٹوٹا ہوا پل، ص۱۵۹

۶۶. ایضاً، ص۱۶۶

۶۷. ایضاً، ص۱۷۷

۶۸. ایضاً، ص۱۸۸

۶۹. ایضاً، ص۱۸۹

۷۰. ایضاً، ص۱۹۰

۷۱. ایضاً، ص۱۹۵

۷۲. شہزاد احمد، مٹی جیسے لوگ، ابتدائیہ، لاہور: ملٹی میڈیا افیرز، ۲۰۰۹ء، ص۷۰

۷۳. ایضاً، ص۷۷

۷۴. ایضاً، ص۷۹

۷۵. ایضاً، ص۸۱

۷۶. ایضاً، ص۹۳

۷۷. ایضاً، ص۹۴

۷۸. ایضاً، ص۹۵

۷۹. ایضاً، ص۹۷

۸۰. ایضاً، ص۹۸

۸۱. ایضاً، ص۹۸

۸۲. ایضاً، ص۱۱۲

۸۳. ایضاً، ص۱۱۳

۸۴. ایضاً، ص۱۲۸

۸۵. ایضاً، ص۱۳۱

۸۶. ایضاً، ص۱۳۳

۸۷. ایضاً، ص۱۳۸

۸۸. ایضاً، ص۱۴۰

۸۹. شہزاد احمد، اربوں سال کی دوری، ابتدائیہ، لاہور: اربوں سال کی دوری، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء، ص۱۱

۹۰. اسد عباس عابد، غزل گو شہزاد احمد، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۸ء، ص۲۳۹

۹۱. ایضاً، ص۲۷۱

۹۲. شہزاد احمد، دیوار پہ دستک، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء، ص۶۵۱

۹۳. شہزاد احمد، دیوار پہ دستک، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء، ص۸۵۲

۹۴. ایضاً، ص۸۵۶

۹۵. شہزاد احمد، دیوار پہ دستک، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء، ص۸۲۷

۹۶. اسد عباس عابد، غزل گو شہزاد احمد، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ص۲۰۱۸ء، ص۱۰۸

۹۷. شہزاد احمد، دیوار پہ دستک، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء، ص۷۹۱

۹۸. ایضاً، ص۱۲۱

۹۹. ایضاً، ص۱۲۷

۱۰۰. ایضاً، ص۱۳۹

۱۰۱. ایضاً، ص۱۴۱

۱۰۲. ایضاً، ص۱۴۵

۱۰۳. ایضاً، ص۱۶۴

۱۰۴. ایضاً، ص۷۹۲

۱۰۵. ایضاً، ص۷۹۳

۱۰۶. ایضاً، ص۸۰۳

۱۰۷. ایضاً، ص۶۱۸

۱۰۸. شہزاد احمد، اربوں سال کی دوری، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳، ص۱۳۸

۱۰۹. ایضاً، ص۱۱۳

۱۱۰. ایضاً، ص۱۱۱

۱۱۱. ایضاً، ص۱۱۱

۱۱۲. ایضاً، ص۱۱۹

۱۱۳. ایضاً، ص۱۲۳

۱۱۴. ایضاً، ص۱۴۱

۱۱۵. ایضاً، ص۱۲۹

۱۱۶. ایضاً، ص۱۶۲

باب چہارم

شہزاد احمد کی نظموں کا فنّی مطالعہ

باب چہارم

شہزاد احمد کی نظموں کا فنّی مطالعہ

شہزاد احمد کے ہاں دونوں مجموعوں میں فنی جہتوں کی کمی نہیں۔ زبان دانی کے اعتبار سے ان کو دیگر نفسیات اور فلسفہ و سائنس پر بھی عبور ہے۔ نظموں کو فنی اعتبار سے دیکھا پرکھا جائے تو اس میں جو نمایاں پہلو نظر آتا یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے شاعر کو سفر زیست میں جتنا مواد ملا اس نے اس کو حقیقت کے آئینے میں دیکھا اور بغیر کسی تصنع کے صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیا۔

شہزاد احمد کا غالب رویہ تعقل پسندی کی طرف جھکاؤ کا ہے۔ وہ چلتے چلتے جذبات کی راہ سے ہٹ کر عقلی روش پر آجاتے۔ ان کے ہاں مظاہر فطرت سے جڑے تمام موضوعات کا فنی پیرائے میں بیان نظر آتا ہے۔

کہیں ''جسم'' کو ''سلونا'' سے تشبیہ دیتے ملتے ہیں۔ اور فنی محاسن انتہائی خوش اسلوبی سے بیان کرتے ہیں۔ جہاں محبت سے سرشار موضوعات کا فنی بیان نظر آتا ہے۔ وہی پر سوچ کی مضبوط خیالی بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ تاہم یہ طے ہے کہ شہزاد احمد کے ہاں تشبیہاتی نظام مضبوط ہے۔ اور اس کی متنوع شکلیں اور پیرائے ملتے ہیں۔

شہزاد احمد نے وقت، جیتا، جاگتا، رفتار آسیب جیسے الفاظ کا استعمال کیا مگر ان میں ایک ٹھہراؤ سا آتا ہے۔ جیسے کوئی منظر آنکھوں کے سامنے آکر ٹھہر جائے۔

مجموعہ (ادھ کھلا دریچہ) میں بھگت سلونا جسم، سانولی جیسے الفاظ کا چناؤ اس مجموعے کے فنی محاسن کی جانب پہلا قدم ہے۔ اور ''انبار'' تلوار، تین، ہیولا، تابانی، تانباکی، شام زمستاں، سانس اور اس کے متبادل کے طور پر بدن کا لفظ شاعر نے استعمال کیا ہے۔

شہزاد احمد کے ہاں الفاظ کا چناؤ نہایت عمدگی سے کیے گئے معلوم ہوتے۔ کبھی (وقت) اور جس تیز رفتاری سے گزر رہا ہے۔ ''ناگ'' کی طرح معلوم ہوتا جو وقت کے ساتھ ساتھ جسم کو ڈستا چلا جا رہا ہے۔ لفظ (سایہ) استعمال کو موضوع نظم بنایا اور سایہ کی تاریکی ان دیکھی چیز کی طرح معلوم ہوتی ہے۔ تو کہیں سانپ کا ذکر۔ فن موسیقی کے ازار کا بیان بھی نہایت فنی زاویے میں کیا گیا۔

محبوبہ کی باتوں کو پھولوں کی حلاوت، آنکھوں کے لیے دریچوں کے جیسے الفاظ کا چناؤ جس مہارت سے ملتا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

گل نو بہار، مہرو ماہ وغیرہ جیسے الفاظ ملتے ہیں اور الفاظ کا فنی جامہ پہنائے جو تراش کر بیان کیے گئے معلوم ہوتا ہے یہ اسی لیے بنائے گئے تھے۔

اس دور میں شہزاد احمد کے ہاں (یاد) کا استعارہ بہت زیادہ پایا جاتا ہے اور اس کے تلازمات بھی، جن میں رفتگاں، منزل، محفل، قافلہ، کارواں، رات، آگ، طوفان اور امید نو وغیرہ اہم ہے۔ یہ مجموعہ اپنی ایک انفرادیت کا حامل ہے۔ اور اس کا فنی اسلوب اپنے آپ میں کل کی مانند بالکل اسی طرح جس طرح ہر نظم اپنے آپ میں کل کی مانند۔

"شہزاد احمد کے سولہ شعری مجموعے اپنے ناموں کے حوالے سے بھی اپنے اندر فکری تنوع رکھتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ فنی حوالے سے بھی۔"[۱]

شہزاد کے ہاں جہاں متنوع موضوعات ملتے وہی ان کے فنی بیان بھی ان گنت پیرائے میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔

"لفظی تنوع کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں فکری تنوع بھی پایا جاتا ہے۔"[۲]

شہزاد احمد کے نظموں کے ہاں جہاں فکری اعتبار سے بلند تخیل اور خیال رکھتی ہے وہی پر فنی اعتبار سے بھی نمایاں نظر آتی ہے۔ انہوں نے محبت اور جوانی کے بارے میں سوال اٹھائے۔ محبت جو کہ ایک فطری عمل ہے۔ جس کے آگے انسان بے بس ہوتا ہے اور اس پر کسی کا اختیار نہیں ہوتا۔ محبت کی چاشنی سے معمور نظمیں ملتی ہیں۔ شہزاد احمد عام فہم اور فطری شاعری کرتے جو کہ ان کی نظموں سے بخوبی پڑھ کر اندازہ ہے۔ جو کہ ہر کسی کی سمجھ میں آجائے۔ وہی عشق و محبت کی وارداتِ قلبی کا بیان ملتا ہے۔

شہزاد احمد جہاں محبت کے موضوع کو خوبصورت پیرائے میں بیان کرتے ہیں وہی پر محبوب کی یاد کو بھی اسی دلفریب طریقے سے بیان کرتے دکھائی دیتے اور محبوب سے دوری کے بعد تنہائی کا در آنا۔

جو تنہائی کے احساس روتی ہو گی
کتنی یادیں ترے اشکوں سے ابھرتی ہوں گی[۳]

(تنہائی کے بعد، ص۶۲۹)

معاشرتی موضوعات، معاشی عدم توازن اور دیگر موضوعات کو شاعر نے فن کے سانچے میں ڈال کر پر خلوص اور شائستہ الفاظ میں بیان۔ شہزاد احمد کے ہاں موضوع، ہیئت اور الفاظ و معنی ایک حقیقت کل کا نام ہے۔ جہاں جزو کل سے الگ ہو کر تشنہ تکمیل نظر آتا ہے۔

شہزاد احمد نے اپنی نظموں میں ذات و کائنات کے بے معنی پن میں بھی ایک معنی تلاش کیا۔ بے کار سے بے کار عام موضوعات کو بھی اس چابکدستی و عمدگی کے ساتھ بیان کرتے نظر آئے کہ عام سے موضوع میں الفاظ کا چناؤ ایسے کرتے کہ جان ڈال دیتے۔

زندگی سطحی اور سادہ حقیقت کا نام ہے۔ اس میں طرح طرح کی تہہ داری اور پیچیدگی پائی گئی اور کہیں شہزاد احمد کے مختلف علامتوں کا بیان پایا جاتا۔ کبھی سوالیہ تو کبھی ندائیہ کی علامت۔ تو کہیں پر جذبات کو سمجھنے سے عاری دکھائی دیتے ہیں اور خود ہی اپنے آپ میں دکھی ہوئے ملامت کرتے ہیں اور ان کو نہ سمجھنے کے بعد ان میں ایک نیا رخ دیکھنے کو ملتا ہے اور وہ جذبات محبوبہ کے بھی اور کسی بھی چیز کے ہو سکتے۔

اب وہ عورت میرے اندر
فنگس کی طرح پھیل گئی ہے
اور میں نے محفلوں میں جانا چھوڑ دیا[۴]

تو کہیں پر وہ جلتے ہوئے چراغوں میں اپنا چراغ جلانے کی بھی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ رنگ و نور سے تعلق رکھنے والے الفاظ دیگر نظموں میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

شہزاد احمد آدمی کو درختوں کی مانند قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ آدمی کا کام ایک جگہ ساکت رہنا نہیں ہے بلکہ یہ تو شجر کا کام ہے۔ آدمی کو بہتر سے مزید بہترین کی تلاش میں اور کائنات کو کھوجنے میں اور حرکت کرتے رہنے سے معمور ہے۔

چلو کہیں کا ارادہ کر لو
کہاں تلک اس زمیں کے ٹکڑے پہ بت کی صورت کھڑے رہو گے
تم آدمی ہو شجر نہیں ہو
نہ تم میں موسم کے رنگ چھونے کا حوصلہ ہے
نہ تم میں بارش کو جذب کرنے کی تشنگی ہے[۵]

زمین کی وسعتوں کا بیان اور اس کی رنگارنگی کو انتہائی لطافت کے ساتھ ذکر ملتا ہے۔ زمین جو کہ خوش گوار بھی اور ناگوار کا مجموعہ ہے۔ دلفریب لہجے میں اس کی ترجمانی کرتا نظر آتا ہے۔

اور یہ دھرتی مہکتے سبز رنگوں کا جہاں

رات کو مہتاب کی چادر میں لپٹی آبشار (۶)

آنسوؤں کی طرح شہزاد احمد کے ہاں بارش، برسات بھی وسیع المعنی نظر آتی ہے اور حبس جو کہ نت نئے آہنگ میں لپٹے نظر آتا ہے۔ خیال کی وسعت نہایت خوبصورت پیرائے میں ڈھلی نظر آتی ہے۔

"وہ اک ننھی سی لڑکی

برف کے گالے سے نازک تر

ہوا میں جھولتی شاخوں کی خوشبو

اس کا لہجہ تھا

چمکتے پانیوں جیسی سبک رو

اس کی باتیں تھیں

وہ اڑتی تتلی کے رنگ پہنے (۷)

اپنے گہرے مطالعے اور خاص کر فلسفے کا نفسیات کا مطالعہ اس گہرائی سے رکھا تھا کہ آپ نے فنی پیرائے میں انتہائی خوبصورت سانچوں میں موضوعِ وسعت کو بیان کیا۔

تشبیہ کا استعارہ اور دیگر شعری فنی محاسن کا برتاؤ انتہائی خوبصورت اور فن کے بیان کے ساتھ کرتے دکھائی دیتے۔

ہر مجموعہ فکری لحاظ سے تو اپنے میں میں بے پناہ معنی سمیٹے ہوئے ہے۔ اسی طرح فنی اعتبار سے بھی اپنے آپ میں بے کراں سمندر کی مانند ہے۔

سورج، چاند، زمیں و آسمان، چرند پرند، درختوں ان سب الفاظ کا بیان ان کے شعری مجموعوں نمایاں ہے اور اپنے آپ میں اکائی کی مانند۔

شہزاد احمد کا ہر مجموعہ فنی پیرائے کے رنگ ڈھنگ پر بخوبی اپنی دلچسپ انداز میں نظر آتا ہے۔

ان کے مجموعے کلام میں "وقت" سب سے اہم علامت ہے جو کہ مختلف طریقوں سے مختلف عوامل کے استعمال ہوئی۔ کہیں "وقت" کو "ناگ" سے مطابقت دیتے نظر آتے ہیں اور "سایہ" کو "آسیب" کی مانند قرار دیتے ہیں۔

نیند کا لفظ شہزاد احمد کے ہاں نئے نئے پیرائے میں نظر آتا ہے۔ کبھی جہالت کی، کبھی پنچھی، کبھی جاگتے ہوئے بھی سوتے ہوئے کی سی حالت۔

> "شہزاد احمد کی شاعری میں ایک ایسا فکری و فنی ماحول ہے۔ جو ذات کی اتھاہ گہرائیوں سے شروع ہو کر کائنات کے مختلف رنگوں تک پھیلا ہوا۔ ان کی شعری داستاں میں بہت سے رنگ جھلکتے ہیں۔ جہاں وہ آشوب ذات اور سماجی جبر و استحصال سے الگ ہو کر خوشبوؤں، ذائقوں اور رنگوں سے مستحور کن مناظر تخلیق کرتے نظر آتے ہیں۔ وہاں ان رنگوں میں رومانوی، سماجی، معاشرتی، سیاسی اور سماجی شعور بھی ملتا ہے۔"(۸)

شہزاد احمد الفاظ کو بنیادی طور پر اظہار کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔ مگر ان کی فسوں سازی کا گہرا شعور ہے۔ وہ افسوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے اپنی نظموں کے لیے موزوں ترین بحور اور الفاظ کا انتخاب کرتے۔ شہزاد احمد کی نظموں کی مجموعی فضا تیرگی، تنہائی اور خاموشی سے عبارت ہے۔ اس کا آہنگ، نرمی، آہستگی، ٹھہراؤ اور دھیمے پن سے عبارت ہے۔ اس فضا کی تخلیق کے لیے انہوں نے جو اسلوب اختیار کیا ہے اس کی ترکیب اسی قسم کے الفاظ و علائم کو اساسی حیثیت حاصل ہے۔ رات، رتجگے، تنہائی، اندھیرا، افسردگی، پتھر، چاندنی، خواب وغیرہ ان کے ہاں یہاں مستعمل ہیں۔ نظموں میں حسب موقع مناسب الفاظ کا برتاؤ دکھائی دیتا ہے۔

تو کبھی شخص ہوا کرتا تھا
سرخ پھولوں کی حلاوت تری تقریر میں تھی
تیرے ہونٹوں پہ ستاروں کی سبک گردش تھی(۹)
(تو بھی کبھی شخص ہوا کرتا تھا، ص۶۳۸)

شہزاد احمد کی نظموں کا فنی پیرایہ انتہائی دلچسپ و دلفریب رنگ ڈھنگ میں لپٹا ہوا ہے کہ ان کے ہاں ہر لفظ فنی اعتبار سے یوں محسوس ہوتا جیسے تخلیق ہی اسی کے لیے کیا گیا۔ خاموشی کے موضوعات تنوع انداز میں لپٹے نظر آتے۔

آخری زخم لگایا تو نے
تو نے خاموشی کی شمشیر سے مارا مجھ کو[۱۰]

(سوتا جاگتا سایہ، ص۶۴۴)

باغ، پھول، مٹی شہزاد احمد کی نظموں میں جدت کے ساتھ پائے جاتے ہیں اور آخرت کی تصویر کشی کرتے نظر آتے ہیں۔

باغ سے، پھول سے، مٹی سے یہ آتی ہے صدا
ظالمو یومِ حساب آ پہنچا
سب سوالوں کا جواب آ پہنچا[۱۱]

(ظالمو یوم حساب آ پہنچا، ص۷۸۵)

سمندر، روشنی، چراغ، حشر، پھول، غم سفر، درخت، برہنگی، خاک، گمان، سورج، ستارے، زمیں یہ سب دکھنے میں الفاظ دکھائی دیتے۔ مگر شہزاد کی نظموں کا منبع یہ الفاظ اور ان کا بیان ممتنوع جہات میں نظر آتا ہے۔

یہ سطح بحر پہ کس کی شبیہ ابھری ہے
یہ کس کا عکس چمکتا ہے موتیوں کی طرح
یہ کون ہے کہ ستوں دونوں ہاتھ میں اس کے
اور اس کی آنکھ ہے گہرے سمندر کی طرح[۱۲]

''خاک'' کا لفظ شہزاد احمد کی نظموں میں مختلف انداز میں نظر آتا استعمال ہوا۔

خاک اک زخم ہے، اک اشک ہے، محرومی ہے
دور تک ریت کے پھیلے ہوئے میدانوں میں
کچھ نہیں خاک کی یک رنگیٔ بے جا کے سوا
سانس لیتی ہے، یہاں گرد سے بھرپور ہوا
کبھی شاداب زمانہ بھی یہاں آئے گا
اے میرے خدا[۱۳]

''رات'' کا منظر، لفظ ''رات'' شہزاد کے ہاں نئے نئے روپ میں نظر آتے ہیں۔ اور ''یاد'' لفظ دیگر نت نئے موضوعات کو فنی لبادے پہنے نظر آتی ہے۔

کوئی بھولی یاد دروازہ دل پہ دستک دے
اور سونے والے کو مژدہ سنائے کہ میں آگئی ہوں
جسے بھولنے کے لیے تو نے کتنی تمناؤں کا خوں کیا ہے
ذرا جاگ اور دیکھ
تیرے لیے میں غموں اور دکھوں کے کئی تحفے لائی ہوں
جن کو زمانوں سے میں نے چھپا رکھا تھا[۱۴]

(سنّاٹا، ص۸۱۸)

کبھی سورج کی تپش اور اس لفظ کا استعمال مختلف پیرایوں میں کرتے نظر آتے ہیں اور اس کی کارفرمائیوں کا فنی بیان توجہ طلب ہے۔

یہ جو بکھرے ہوئے زرد پتے
ان کی رگوں میں
فقط دھوپ کا زہر ہے۔۔۔ خوں نہیں ہے
کبھی ان رگوں میں بھی خوں تھا
جسے دھوپ شبنم سمجھ کر چرا لے گئی ہے
کبھی ان کے چہرے ہرے تھے
کبھی ان سے چھو کر گزرتی ہوا سٹیاں بھی بجاتی رہی ہے[۱۵]

(زندانی، ص۸۲۶)

روح کو پھول جسم کو زنداں قرار دیتا ہے شہزاد احمد۔

روح وہ پھول ہے جس کی خوشبو
جس کے زنداں میں گھٹ کے رہ جائے
جسم کا زنداں۔۔۔ جس کا کوئی دروازہ ہے نہ روزن ہے[۱۶]

(ہیولوں کے زنداں، ص۸۳۴)

فنی پیرایہ اتنا وسعت کا حامل ہے کہ کہیں ایک ہی نظم میں سب موضوع سمیٹنے کی کوشش دکھائی دیتی ہے۔

آج کی رات میں لکھ سکتا ہوں اپنے دکھ کی باتیں
گھر میں آج کوئی بھی نہیں ہے
میں ہوں اور تنہائی ہے
یہ تنہائی لوٹ کے برسوں بعد آئی ہے![۱۷]

(پہلا لمحہ، ص ۱۰۰۵)

خاک کے تصور کو تقدس کے ساتھ پیش کیا۔ وہ یہ ذرات، یہ رنگ اور نورِ عظمت و جلال کے معنوں میں لے کر پیش کرتے ہیں۔ شاعر مظاہر فطرت کائنات خالق کے حسن کا پرتو سمجھتے ہیں۔ ان کے مطابق یہ دنیا اور موجود مظاہر فطرت خالق کائنات کے وجود، عظمت اور جلال کا بین ثبوت ہے۔

"شہزاد احمد نے اس استعارے کو اور بھی وسعت دی اور انسانی وجود کو زمان و مکاں کی وسعتوں سے ہم آہنگ کیا۔"[۱۸]

شہزاد احمد پرانے موضوعات کو بھی نئے قالب میں ڈھال دیتا ہے۔ احساسِ تنہائی، انتشار و تحفظ ذات، شکست و انا، بے مقصدی و لاحاصلی، بے چہرگی اور چہرے پر کئی چیزوں کا نقاب، ہجرت، بے گھری اور دربدری جو عموماً معاصر شعراء کے کلام کے موضوعات رہے ہیں۔ ان کو بھی شہزاد احمد نے ایک ایسی زبان اور نیا اسلوب عطا کیا۔ جو دورِ حاضر کی حسیت سے ہم آہنگ ہو کر پرانی بنیادوں پر قائم رہتے ہوئے بھی نئے امکانات کی طرف اشارہ کرتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ان کی نظمیں مستقبل کی نظموں کا مستقبل ہیں۔

انسان کو اپنی بصیرت کا پوری طرح علم نہیں ہوتا۔ جو کچھ ہمارے اندر موجود ہے کوشش کے باوجود بھی ہم اس سے پوری طرح آگاہ نہیں ہوتے۔ روشنی کا حد نظر تک پھیلنا مکمل آگاہی ہی کی علامت ہے۔ پوری آگاہی یا مکمل ادراک انسانی وجود کو متشبہ کر دیتا ہے۔ انہی مفاہیم کی ترجمانی کرتے کم و بیش نظر آتے ہیں۔

شہزاد احمد نے شعوری طور پر بعض سائنسی پیش رفتوں اور بعض سائنسی تصورات اور اصطلاحات کو اپنی نظموں کا موضوع سخن بنایا۔ جنگل، پتھر، دیوار، سورج، دھوپ، صحرا اور آنکھ بہت نمایاں استعارے ہیں اور یہ نظم میں مختلف موضوعات کو بیان کرنے کے لیے استعمال ہوئے۔

شہزاد احمد کے ہاں ہر لفظ کسی نہ کسی استعارے کے زمرے میں دکھائی دیتا ہے۔ ”رات“ کا استعارہ شہزاد احمد کے ہاں دیگر موضوعات سمیٹے ہوئے ہے۔

شہزاد احمد خیال کو لفظ میں ڈھالنے اور خیال کو ایک کر دینے کا ہنر جانتے تھے۔ شہزاد احمد کی شعری کائنات خاص کر نظمیں ان گنت موتی اپنے آپ میں سموئے ہوئے نظر آتی ہے۔ ”روشنی“ کے استعارے اتنے استعمال ہوئے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ شہزاد احمد کو جیسے روشنی سے خاص رغبت ہو۔

شہزاد احمد کے ہاں نظموں میں اخلاقی، معاشرتی اور معنی آفرینی کے وہ تمام جوہر موجود ہیں جو اصلی اور سچی شاعری کی شناخت ہے۔ جن سے مستقبل کی شاعری بہرہ یاب ہو سکتی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو اصل شاعری وہی ہے جس کے دروازہ سخن کی شاعری دستک دے اور جب اس کا دروازہ کھلے اس کے اندر بے معنی و مفہوم کا مہر درخشاں طلوع ہوتا ہوا معلوم ہو۔ شہزاد احمد ایسے ہی شاعر تھے۔ ہمیشہ جستجو کرتے معلوم ہوتے۔

زبان کے اعتبار سے اور جملوں کے استعمال کرنے کا بہترین ہنر شہزاد احمد کی نظموں میں ہمیں دکھائی دیتا ہے۔ فنی اعتبار سے ان کی نظمیں عمدہ اور اہمیت کی حامل ہیں۔

فطرت کے عناصر کو اپنی شاعری کی زبان و لفظیات میں بڑے اچھے انداز سے سمویا۔ ان کے ہاں سمندر ساحل، برفیلی ہوائیں نہ صرف تمثالوں کی تشکیل میں معاون ثابت ہوتے بلکہ ان کے کلام کو تازگی و حسن بھی عطا کرتے۔

ان کی نظموں کے تجزیہ کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انہوں نے اپنی نظموں میں انسان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو خاطر میں لائے۔ دکھ اور غم میں انسان کو زندگی کا سراغ ملتا ہے۔ مگر زندگی کی شگفتگی کے لیے عشق و محبت اور خوشی کے پہلوؤں کو ہاتھ سے جانے بھی نہیں دیتے۔ فطرت کے عناصر کو بھی اپنی نظموں کی زبان و لفظیات کو بہت خوب صورتی سے جگہ دیتے ہیں۔ محبوب اور عشق کی داخلی کیفیات و احساسات کی مصوری نہایت چابکدستی سے کرتے نظر آئے۔ فنی لحاظ سے وہ اپنی نظموں میں مکالماتی انداز، خود کلامی جیسے اوصاف کے ساتھ ساتھ تشبیہات و استعارات، علائم و رموز اور تمثالوں کا بھی نہایت خوبصورتی سے کرتے ہیں۔ قومی موضوعات پر نظمیں ان کے جذبہ حب الوطنی اور معاصر سیاسی صورت حال سے آگاہی کی دلیل ہے۔ ان کی نظموں کی مجموعی ضفا انسانیت اور ملک و قوم سے محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ فنی سطح پر ان کی مہارت قابل دید ہے۔ شعر کہنے اور نظمیں کہنے کا اپنا انداز ہے۔

"شہزاد احمد اپنی تازہ خیالی اور نظم نگاری سے افق شعر پر صبح کے ستارے کی طرح نمودار ہوا اور اس کو دیکھتے دیکھتے ایک مثالی باغبان کی طرح گلزار شعر و سخن میں تازہ اور دل آویز پھول کھلانے شروع کر دیے۔"(۱۹)

شہزاد احمد کے ہاں تشبیہ و استعارات، شعری صنعتوں کا بدرجہ بیان دیکھنے کو ملتا ہے۔

گھاٹ گھاٹ کا پانی پینا
میری بھی تقدیر رہا ہے
تم نے بھی دنیا دیکھی ہے
پھر بھی ہم جب ملتے ہیں
بچوں جیسی معصومی سے باتیں کرتے ہیں
تم کہتی ہو
آج سے پہلے تیرے جیسا کوئی نہیں تھا
میں کہتا ہوں
میں نے تجھ کو چہرے میں تلاش کیا ہے!
تم کہتی ہو
میرا دل دوشیزہ دھرتی جیسا ہے
میں کہتا ہوں
میں اس دوشیزہ دھرتی کی پہلی بارش ہوں
لیکن ہم پہ ہوا ہنستی ہے
پیار سے آکر لپٹ جاتی ہے
اور کہتی ہے
میں بھی پہلی بار چلی ہوں(۲۰)

(ہم اور ہوا، ص ۱۰۱۳)

شہزاد احمد کے ہاں نظموں میں صنعتوں استعمال بھی دیکھنے کو ملتا ہے اور لفظوں کو ایسی مہارت سے جال بنتے نظر آتے ہیں کہ اپنی مثال آپ ہے۔

وہ اک ننھی سی لڑکی
برف کے گالے سے نازک تر
ہوا میں جھولتی شاخوں کی خوشبو
اس کا لہجہ تھا
چمکتے پانیوں جیسی سبک رو
اس کی باتیں تھیں
وہ اڑتی تتلیوں کے رنگ پہنے
جب مجھے تکتی
تو آنکھیں میچ لیتی (۲۱)

(آنکھ مچولی، ص ۱۰۲۷)

شہزاد احمد کی نظم "میں سے میں تک" دنیا بس تمہارے لیے ساز گار ہے۔ میں کو اپنے اندر نہیں اترنے دیتی۔ یہاں ہستی کی لغت بس ایک صیغے پر مشتمل ہے۔ مخاطب بھی "تم" ہے اور متکلم بھی۔

مگر تم کو اتنا تو معلوم ہے
تم یہاں پر اکیلے ہو
تخریب کی زرد خواہش تمہیں مرنے دیتی نہیں
زخم رکھتی ہے ہر دم ہرے
بھرنے دیتی نہیں
اک چبھن ہے
جو آرام کرتی نہیں، کرنے دیتی نہیں (۲۲)

(میں سے میں تک، ص ۱۹۵)

(تم) بن کر تنہا ہو جانا ایک مہمل معدومیت میں مبتلا ہو جانے کے مترادف ہے اور یہ "تم" بھی شخصی نہیں بلکہ نوعی ہے۔ ساری نوع خود اپنے لیے ادراک و اظہار کی ہر سطح پر "تم" بن گئی ہے۔ اس کا اکیلا پن تاریخ ہستی کا سب سے بھیانک واقعہ ہے۔ جس نے عدم کو معنویت کو بھی مسخ کر دیا۔

جہاں ''میں'' اور ''تم'' کسی امتیاز کے بغیر ایک تھے۔ اس کے لیے پہلی بار ہم یعنی جمع متکلم کا صیغہ استعمال کیا گیا۔

کیا خطا تھی ہماری!
ہمیں جنتوں سے نکالا گیا
اور جنگل میں بن باسیوں کی طرح ہم کو پالا گیا
دل میں تخریب کرنے کی خواہش کو ڈالا گیا[۲۳]

(میں سے میں تک، ص ۱۹۵)

کیا خطا تھی ہماری! اس استفہام میں جو اب ایک ایسی ان کہی کی طرح موجود ہے جو اظہار سے زیادہ مکمل اور جامع ہوتی ہے۔

مگر اس قدر آگہی بھی بہت ہے
کہ اک اور ''میں'' یا کئی ''میں''!
بن میں پھیلی ہوئی بے حسی کی طرح ہیں۔۔۔![۲۴]

(میں سے میں تک، ۱۹۷)

انا اپنے تعین سے نکل جائے تو شعورِ انا بھی لا محالہ ہے۔ غیر متعین ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ''میں'' کا سب سے نچلا مگر ٹھوس مصداق، یعنی کہ شخصیت کے حدود بھی ٹوٹ جاتے ہیں اور انا ایک ان گھڑ واہمے کی طرح لایعنی اور بے مصرف ہو جاتی ہے۔ اس تینوں مصرعوں میں نظم کا جو ہر سمٹ آیا ہے۔ ''آگہی''، ''اک اور میں''، ''کئی میں''، ''بن'' اور ''بے حسی'' بہت اہم کلمات ہیں۔ معنی کا ایسا وفور ہے کہ ان کی لفظیات جیسے محو ہو گئی۔

شعور کی کل پونجی یہی (میں) ہے۔ جو ایک خالی لفظ کی طرح ہے۔ جسے کسی بھی معنی سے بھرا جا سکتا ہے۔

میں سے میں تک بہت فاصلہ ہے
مگر فاصلہ بھی نہ ہونے کی تصدیق ہے
ایسا زندیق ہے
جس نے سارے جہاں توڑ کر ریزہ ریزہ کیے ہیں[۲۵]

(میں سے میں تک، ص ۱۹۹)

(زندیق) کا لفظ اچانک آیا۔ یہ محض (تصدیق) کا قافیہ نہیں۔ بلکہ معنوی بناوٹ میں ایک نئے عنصر کا اضافہ کرتا معلوم ہوتا۔

"زندیق" اس شخص کو کہتے ہیں جو ایمان کے کلمے کو کفر کے معنی میں استعمال کرتا۔ فاصلہ جس کی وجہ سے "میں سے میں تک" ایسا فقرہ کہنا ممکن ہوا۔ زندیق اس معنی میں کہ "میں" نے ذات سے خالی کر دیا ہے یعنی لفظ برقرار ہے مگر معنی غائب۔ ذات سے خالی ہو کر (میں) ایک خلائے محض کا ظرف بن کر رہ گیا ہے۔ جس نے اس کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا بلکہ فنا کر ڈالا۔ ظاہر ہے معنی سے محرومی کسی چیز کو متعین نہیں رہنے دیتی اور وحدت تعین ہی پر قائم ہوا کرتی۔

الفاظ کے حسن استعمال کے علاوہ شہزاد احمد نے ترکیب سازی میں بھی مہارت کا ثبوت دیا۔ ان کے ہاں تراکیب بھی موجود ہے۔ ایک موضوعات جو پرانے اور ان کے لیے موزوں تراکیب پہلے سے موجود ہیں۔ ان کا استعمال بھی شاعر نے کیا اور جدید موضوعات، عصری حسیت کے حوالے سے تخلیق کی گئی نظموں میں شہزاد احمد نے موقع و محل کو دیکھتے ہوئے ذاتی تراکیب بھی تخلیق کی۔

شہزاد احمد نے اپنے تجربات کو کلیت کے ساتھ بیان کیا اور اپنے کلام کو بے جا علمی اصطلاحات اور غیر مانوس لغات سے بھرنے سے اجتناب کیا۔

نازک مزاج، فلسفیانہ فکر، سائنسی شعور اور طبع سلیم رکھنے والے قاری ایسے بے جا دقیق الفاظ کے استعمال کو پسند کرتے ہیں اور نہ بوجھل اور عامیانہ الفاظ سے لطف لے سکتے۔ شہزاد احمد نے عصری موضوعات میں بھی ایسے الفاظ کا چناؤ کیا جس سے فنی حسن ہر جگہ مترشح ہوتا ہے اور کہیں بھی بدمزگی پیدا نہیں ہوتی۔

محبت ہمیں ایک دوسرے سے
چاہتے ہیں ایک ہو جائیں
مگر ہم ان ستاروں کی طرح ہیں
جو کبھی ایک دوسرے کو چھو نہیں پاتے
ہمیشہ دور ہی سے دیکھتے رہتے ہیں
قربت کی کبھی خوشبو نہیں پاتے [۲۶]

(محبت کل جو تھی، ص ۱۸۳)

شاعر نے تمام مجموعوں میں مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا۔ شدید جذبات و احساسات کے اظہار میں بھی شدت بلند آہنگی اور تلخ نوائی کا در آنا فطری امر ہے۔ شہزاد احمد اس سلسلے میں دھیمے، مدھم اور گوار انداز میں جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ سیاسی، نفسیاتی یا جمالیاتی موضوعات میں بھی انہوں نے شدت اظہار یا تلخی سے احتراز کیا۔ جبر و استداد ہو یا کوئی شدید احساسات ابھارنے والے عوامل کا ذکر وہ سبک، گوارا، رمزی، اسمائی پیرائے میں کرتے نظر آتے ہیں۔ ہنگامی جذبے یا لمحاتی کیفیت کو پیش کرنے پر اکتفا نہیں کرتے۔ بلکہ جذبے کو فکر کی آمیزش سے چمکا کر پُر وقار انداز میں سامنے لاتے ہیں۔ یوں وہ جذبہ ہنگامی رہنے کی بجائے مستقل اور ابدی بن کر عالمگیر حیثیت اپناتے نظر آتے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد آہستہ آہستہ شہزاد احمد کی نظموں کے سیاسی موضوعات سے شغف بڑھتا گیا۔ مگر سیاسی و تمدنی موضوعات اور آشوب پر لکھتے وقت بھی شہزاد احمد اپنی ادبی تربیت اور اپنی شعری افتاد سے روگردانی نہیں کرتے۔ ان سب فکری پیرایوں کو فنی لبادے میں نظم ''آشوب'' کی صورت میں بیان کیا۔

شہزاد احمد کی نظموں میں تخیل کی فراوانی ہے۔ بعض رومانوی شعرا کی طرح شدت احساس وجذبات کی فراوانی میں عقل کا دامن چھوڑ کر فنی بے اعتدالی کا شکار نہیں ہوتے۔ تخیل کے سفر میں وہ جتنی بھی بلند پروازی کرتے ہیں پابگل رہتے ہیں۔

شدید داخلیت اور ابہام سے دور نظر آتے ہیں۔ ان کا فن اور خیال مل کر اسلوب میں معنویت کا باعث بنتے ہیں۔ شاعر تخیل کے اظہار میں کسی مجبوری یا پابندی کا قیدی نہیں۔ تخیل کے اظہار میں خارج اور داخل کی دنیائیں ان کے ساتھ ساتھ چل رہی ہیں۔ علامتی سلسلے بھی آتے ہیں۔ تخیل کے اظہار میں قاری کے لیے ایسا قرینہ یا وسیلہ ضرور ہوتا ہے۔ جہاں وہ دل میں آباد دنیا میں جھانک کر اس تجربے کی جھلک دیکھ سکے جس سے تخلیق کار گزرا ہے۔

یہ ایسے مسئلے ہیں
جن کا کوئی حل کبھی تو نے بنایا ہی نہیں تھا
یہ کام اب ہم کو کرنا ہی پڑے گا
بشر ہونے کا یہ مطلب نہیں، ہم کچھ نہیں (۲۷)

(بشر ہونے کا مطلب، ص۱۸۸)

شہزاد احمد نے اپنی شاعری خاص کر نظموں میں صرف فکر و فن کی آمیزش نہیں کی بلکہ جذبہ اور تصور کی آمیخت سے اپنے تجربات کے عقلی، علمی اور حسیاتی جہات پیش کیں۔ بڑی بات یہ کہ انہوں نے اپنی تمام لمبی نظموں میں

اس امتزاجی عمل میں توازن برقرار رکھا۔ تصوراتی پہلو کو شاعرانہ خیال پر مسلط کر کے احساساتی اور جذباتی سطح کو مغلوب بنانے سے بھی احتراز کیا۔ جذبے اور تصورات کے امتزاج کے لیے انہوں نے الفاظ کے باہمی تعلق اور ترتیب و ترکیب کا خیال رکھا۔ یوں نئے پرانے الفاظ کے استعمال سے ذاتی واردات اور تخیل کی نئی دنیائیں آباد کیں اور ان میں ابتدا سے انجام تک کی روداد اور اونچ نیچ، اتار چڑھاؤ سب کا بیان ملتا ہے۔ نظم ''ساقی نامہ'' اس کی عمدہ مثال ہے۔

شہزاد احمد کی شاعری میں محبت، وارداتِ قلبی کے بیان کے علاوہ مناظر فطرت کے عناصر بھی دیکھنے کو ملتے۔ احساس اور خیال کی تجسیم کاری کے دوران بھی قدرت کے مناظر سے کام لیا۔ کہیں خود سے تو کہیں تخلیق کار سے سوال کرتے نظر آتے ہیں۔ ''سورج'' لفظ کا مختلف معنوں میں مختلف سانچوں میں شہزاد کی نظموں میں ذکر آیا ہے اور کثرت سے۔ مجموعی طور پر یہ خاص اہمیت کا حامل لفظ ہے۔ جس کو شاعر نے نت نئے روپ میں ڈھال کر انتہائی جدت خیالی کے ساتھ فنی پیرائے میں اس کی مختلف مقامات پر تجسیم کاری کرتے نظر آتے ہیں۔ کہیں خاک اور موت کا استعارہ بیان ہوا۔

خاک کر دے گا کسی دن مجھے تنہا ہونا
موت سے بڑھ کے نہیں کوئی رفیق (۲۸)

(آج تک، ص۱۹۱)

شہزاد احمد کی نظموں میں تلخ حقائق اور ٹھوس مسائل تخیلاتی فضا کے ساتھ ابھرتے ہیں۔ اس صورت حال میں یہ تلخ حقائق منظر کشی کے لیے بنیاد بنتے ہیں۔ یہ تخیل کے ساتھ بندھے ہوئے اور آزاد دونوں شکلوں میں موجود ہوتے۔

شام زمستاں، خزاں بہار فطرت کے یہ تین روپ شہزاد کے ہاں بار بار اپنی رعنائیوں اور جلوہ سامانیوں کے ساتھ رونما ہوتے ہیں۔

اپنی شاعری کے آغاز سے وہ فطرت کے گوناگوں عوامل کو علامت کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور انسانی جذبات کے ابلاغ کے لیے نئے نئے پیکر تراشتے ہیں۔ اس لیے ان کی شاعری توجہ چاہتی ہے۔ وہ توجہ جس سے شاعری کا طلسم اور اس کی تہیں کھلتی ہیں۔

تو کہیں پر شہزاد احمد موت کے لیے ''نیند'' کا استعارہ استعمال کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

یہ سفر گو جان لیوا ہے
مگر میں سوچتا ہوں

کس قدر ہلکا ہوں میں
جس طرف چاہوں نکل جاؤں
خلا ہر سمت سے آواز دیتا ہے مجھے
دور ہوتی کائنات! میں تمہارے پاس ہوں
تم سے ملنے کی طلب دل کے ہر اک گو
اب تو حائل ہی نہیں ہے کوئی شے (۲۹)

(نیند کے بعد، ص ۲۱۱)

شہزاد اپنے فنی سفر میں کسی مقام پر رکے ہوئے نظر نہیں آتے بلکہ وہ بنے بنائے سانچوں پر اکتفا کرنے کی بجائے نظموں میں نئے امکانات کی راہیں کھولتے نظر آتے ہیں۔ انہیں ابتدا سے ہی میر انیس، یگانہ، غالبؔ اور اقبالؒ جیسے رجحان ساز اشخاص نے اپنے عہد کے علوم سے فائدہ اٹھایا اور علم کو شاعری پر سوار نہ کیا۔ یہ وہ تھے شعراء جنہوں نے اپنے عہد سے سوال کیے اور اپنے نقوش چھوڑے۔

شہزاد احمد کا ہر شعری مجموعہ کے حوالے سے اپنے اندر الگ رجحانات اور موضوعات کا ایک سلسلہ رکھتا ہے۔ ہر مجموعے کے اندر استعاروں، علامتوں اور تشبیہات کا نیا پن پایا جاتا ہے۔ اور اپنے موضوعات کو صرف غزل تک محدود نہیں رکھا بلکہ نظم، آزاد نظم، نثری نظم کے اندر بھی خوب صورت خیالات کا اظہار کیا۔

لہٰذا ہجرت کے اندوہناک تجربے نے مسلمانوں کے اندر ایک انسیت پیدا کر دی تھی۔ جس کے باعث لوگوں نے اس حادثے کو برداشت کیا۔ سرحدوں میں تبدیلی کے باعث انسانوں کا ایک مقام سے دوسرے مقام تک منتقل ہونا جس باعث انسان اپنا ایک پورا روپ کھو چکا تھا۔

ان کے ہاں نمایاں سب رجحان ''یاد'' کا ہے۔ ان کے ہاں احساس تنہائی بھی بکھری بکھری ہے اور احساس تنہائی کے اندر بھی ایک شدید قسم کا کرب موجود ہے۔ وہ کسی کی موجودگی میں بھی علاج دل نہیں محسوس کر رہے۔ تنہائی کا غم دور کرنے کو نفسیاتی طور پر کائنات میں غور و فکر کرتے کرتے آسمان اور ستاروں سے ہوتے ہوئے اپنے مالک و مولا کو بھی تنہائی کا غم سنا رہے ہیں۔

شہزاد احمد کے ہاں فنی لب و لہجہ دلچسپ طریقوں سے سجا ہوا نظر آتا ہے۔ تشبیہات و استعارات کا استعمال جو کہ ان کی نظموں میں مزید خوبصورتی کا باعث بنتا ہے۔

نظم ''زمین کانوحہ''زمین کو استعارہ بنا کر مختلف زاویوں سے تصویر کشی کی گئی نظر آتی ہے۔

خاک اور برف میں غرق یہ رات
آخر کہاں تک چلے گی؟
افق تا افق دیکھنے کے لیے۔ کچھ نہیں
جو ستارے ہمارے اب وجد نے دیکھے تھے
معدوم ہو چکے (۳۰)

(زمین کانوحہ، ص۱۸۳)

''آسمان''، ''سمندر'' کے استعارے ہر جا ملتے ہیں۔

آسمان بھی سمندر کی مانند ہے
اس میں چلتی ہے تاروں بھری کشتیاں (۳۱)

(آسماں کی طرف، ص۱۸۸)

شہزاد احمد نے نظم اور نثر دونوں جہتوں میں قابل ذکر کام کیا۔ نظم کے حوالے سے ان کی اپنی ایک الگ دنیا ہے۔ انہوں نے پابند نظم اور آزاد نظم کے ساتھ ساتھ نثری نظمیں بھی کہیں۔ موضوعات اس قدر متنوع ہیں کہ اس کی مثال پہلے سے موجود نہیں۔ ان کی ہر شعری تخلیق ایک الگ فکری و فنی انداز کی حامل نظر آتی ہے۔ شاعری اور نثر میں الگ الگ پہچان رکھتے ہیں۔ محبت مابعد الطبعیات کے ساتھ ساتھ سائنس کے بھی رنگارنگ موضوعات کی فراوانی ہے۔ انہوں نے بہت سے چراغوں کی موجودگی میں اپنا ایک الگ چراغ روشن کیا۔ جو پہلی ہی نظر میں جانا پہچانا جاتا ہے۔ اور معنی کی تہیں اور فراوانی نظر آتی ہے۔

وہ نظموں میں درخت یعنی عوام اور ظالم حکمران کے لیے بطور علامت استعمال ہوئی۔ اس لفظ ''درخت''یعنی عوام کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ہوا چلتی ہے تو درخت خوش ہوتے ہیں۔ لیکن انہیں پتا نہیں ہوتا کہ اس کے ہوا کے جلو میں تباہ کن آندھی بھی موجود ہوتی ہے۔ یعنی عوام ہمیشہ حکمرانوں کے دھوکے میں آکر ظلم سہتے ہیں۔ نظم ''ساقی نامہ'' انسانی ظلم و بربریت، ناچارگی اور بٹنے کا دکھ سب کا بیان ان کی یہ نظم عملی جامہ پہنے ہوئے ہے۔

نظم ''ساقی نامہ'' شہزاد احمد کی فنی محاسن پر انتہائی عمدگی کے ساتھ اترتی نظر آتی ہے۔ محبت کا بیان، احساس تنہائی، یادِ ماضی اور دیگر موضوعات کو فنی خوبصورتی سے اس طرح بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ حق و باطل، نیکی و بدی کا تصور اس سب سے متعلق اس نظم میں ملتا ہے۔

جدید دور کے انسان کی زندگی ماضی کے انسان سے بالکل مختلف دکھائی دیتی ہے۔ آج انسانوں میں نمائش کا پہلو غالب آچکا ہے۔ اور انہوں نے اپنی اخلاقی اقدار سے ناطہ توڑ لیا۔ تہذیبی انقلاب کے اس عہد میں مہذب انسان انسانیت کے درجے سے گر چکا ہے اور ہر طاقتور کمزور کا استحصال کر رہا ہے۔ انسان ہے کہ فطری طور پر خود کو تباہ کرنے میں مصروف عمل ہے۔

''یاد'' کا عنصر شہزاد کے ہاں مختلف جہتوں میں استعمال ہوا ہے۔ کبھی یادِ ماضی، کبھی موت، کا استعارہ، کبھی زندگی کی نشانی کے طور پر۔ جیسے کہ

یاروں نے کہا تجھے موت آئے
سو آئی اور ڈٹ کر آئی
پیاروں نے کہا تم زندہ رہو،
سو ان کی دعا سے زندہ ہوں
لیکن یہ راز نہیں کھلتا
معدوم ہوں یا پائندہ ہوں (۳۲)

(نیند اچاٹ کرنے والی ایک نظم، ص ۱۴۷)

شہزاد احمد کے ہاں ''سنگ ریزوں'' کا لفظ بھی مستعمل ہے۔ یہاں تک کہ ویرانے میں بھی شاعر شعور لاشعور کی سرحدوں پر لرزاں، سرئیلی کیفیات اور احساسات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

میں۔۔۔ مری جلتی ہوئی آنکھیں
مرے بے جان ہونٹ
کتنے پتھر ہیں۔۔۔ جو تیرے ہاتھ کے محتاج ہیں
چاہتے ہیں تو مسیحائی کرے
اک جھلک دکھلائے، ہر اک شے کو سودائی کرے

پتھروں میں مورتیں ہیں
مورتوں میں جان ہے
روشنی اس تیرگی میں اس قدر ہے
آدمی حیران ہے
کاش تو ان پتھروں کے دل کی دھڑکن سن سکے
کاش تو اس آسماں سے کچھ ستارے چن سکے[۳۳]

(سنگ ریزے، ص۱۶۱)

''ٹوٹا ہوا پل'' شہزاد احمد کی موت سے روبرو ہونے کے بعد دوبارہ زندگی کا حاصل ہونا ان سب کا ذکر ملتا ہے۔ یہ مجموعہ خاص اہمیت کا حامل ہے۔

شہزاد احمد نے کشمیر کے پس منظر میں بھی ایک نظم تخلیق کی۔ ''اجنبی کون ہے تو!'' کے نام سے۔

دیکھ ہر سمت سے شعلے اٹھے
آگ کے پھول کھلے شاخوں پر
خلق کے شور سے دھرتی کانپی
جاگ اٹھی ہر بستی
پھٹ پڑے سینۂ گیتی سے کئی فوارے
خون اور عزم کی کرنیں پھوٹیں
اس سے پہلے کہ یہ شعلہ تجھ کو۔۔۔
تیری نسلوں کو جلا کر رکھ دے
اپنے دامن کو بچا
مدتیں بیت گئیں تو نہ مجھے جان سکا
اجنبی کون ہے تو؟[۳۴]

(اجنبی کون ہے تو؟، ص۱۶۸)

شعلوں کو نسلیں جلانے کے مجازی معنوں میں بیان کیا گیا۔ شہزاد کے ہاں فنی محاسن، تشبیہ، استعارہ، صنعتوں کا برملا استعمال نہایت عمدگی سے کیا گیا نظر آتا ہے۔ تمثال کاری کے پیکر، تجسیم کاری کے نمونے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔

ان کی نثری نظمیں بھی اپنے اندر بے کراں سمندر کی مانند فنی محاسن سموئے ہوئے ہیں۔

اس نظم کے درمیان باہم جوڑنے والا کوئی قرینہ دکھائی نہیں دیتا۔ یہ ہی معاملہ نظم "پھر یوں ہوا"، "ہوا سمندر ہے" ہے۔ جو بحروں میں بھی الگ الگ نظر آتی ہے۔ شاعر خاص طویل نظموں میں قاری پر اعتماد کرتے ہوئے اس کے غور و فکر کے لیے ایک گنجائش چھوڑ کر گزرتے ہیں۔

خوبصورت صنعتوں کا اظہار خوبصورت انداز سے کرتے نظر آتے۔ ان کی اکثر نظموں میں ایسے الفاظ نظر آتے ہیں جو صنعت مراۃ النظیر کے زمرے میں آتے ہیں۔ باغ کا منظر بیان کرتے ہوئے اس صفت کا استعمال کیا۔ مختلف نظموں میں ان کا رجحان واضح ہو کر سامنے آتا ہے۔ کبھی تشبیہ و استعارہ کی صورت میں، کبھی منظر نگاری کی صورت میں، اور کبھی صنعت مراۃ النظیر کی صورت میں۔ اسی بنا پر یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ ان کی نظموں میں تنوع کی واضح صورتیں ملتی ہیں۔

صنعتوں کا استعمال کلام کی خوبصورتی میں اضافہ کے لیے کیا جاتا ہے اور بعض اوقات اپنے بیان کو اپنی بات کو پر زور بنانے کے لیے تاکہ وہ قاری کے دل پر ثبت ہو جائے۔ کسی بھی صنعت کا استعمال کیا جاتا ہے اور بعض اوقات صنعت مراعات النظیر جیسی صفت کا استعمال مختلف لفظوں کو ایک ردھم میں پرونے کے لیے کیا جاتا ہے تاکہ جو الفاظ کلام میں لیے جا رہے ہیں ایسے طریقہ اور ایسے عمدہ طریقہ سے استعمال کیے جائیں کہ کلامی معنویت میں اضافہ ہو جائے۔

شہزاد احمد کی نظموں میں اکثر جگہ پر اس صنعت کا انتہائی خوبصورتی اور گراں قدر استعمال کیا گیا ہے۔ تاکہ قاری مسحور ہو جائے اور جو مفہوم شاعر کے دل میں جاگزیں ہے وہ بھی واضح ہو جائے۔

شہزاد احمد کے ہاں اس کا استعمال کہیں بہار کی منظر کشی کے لیے کہیں کوئی تاریخی واقعہ کی یاد دلانے میں اور کہیں پر روز مرہ زندگی کے عام معمولات کو واضح کرنے میں۔ مگر ہر جگہ ان کا لہجہ متنوع ہوتا ہے۔ اس میں یکسانیت ہر آدمی اپنے عہد کے حالات و واقعات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ پاتا۔ اسی طرح شعراء بھی اپنے عہد کے حالات و واقعات، رنج، مصیبتوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان کی نظموں کے ہاں فکری تنوع کے ساتھ ساتھ فنی تنوع بھی نظر آتا ہے۔

شعری کائنات کی لطافت اور سائنسی کائنات کا منطق دو الگ متضاد رجحان ہیں۔ ان رجحانات کے اسلوب بھی الگ ہیں۔ ان دونوں کے رجحانات کو آپس میں ملانا کمال کا کام ہے اور پھر نہ صرف ان کو ملانا بلکہ ان میں معنی خیزی اور جامعیت پیدا کرنا شہزاد احمد کا ہی کمال ہے۔

آزادی کے بعد کی اور ہجرت کے باعث بے گھری کا احساس نمایاں نظر آتا ہے۔ فسادات کی آگ میں دہکتے ہوئے انگاروں کے ساتھ ساتھ بہت سے دکھوں کی کار فرمائی بھی ملتی ہے۔ وطن کو چھوڑ کر کئی دوست گم ہوئے، کئی گھر تباہ ہوئے جس کے باعث تنہائی، افسردگی، بے بسی جیسے خدشات در آئے۔ شہزاد احمد بھی اس قافلے کے فرد تھے۔ انہوں نے اس المیے کو کس طرح اپنے اندر جذب اور اپنی شاعری کا حصہ بنایا۔

نہیں پائی جاتی۔ جس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس الفاظ کا بہت سا ذخیرہ موجود ہے۔ جس کو بروقت استعمال میں لا کر اپنی بات میں وزن پیدا کرتے۔ اس خوبصورت صنعت کا استعمال وہی کر سکتے جن کو الفاظ کا گہرا شعور ہو۔

ایک دائرہ ہے جس میں ہر چیز گھومتی ہے
ہے رقص میں یہ عالم تصویر جھومتی ہے (۳۵)

لہٰذا استعمال کسی بھی صفت کا ہو مگر اس کو اس طریقہ سے کلام میں شامل کرنا کہ واضح ہو کر قاری کے دل میں اتر جائے۔ یہی کسی شاعر کا کمال ہے۔ یہ کمال ہمیں شہزاد احمد کی نظموں کو پڑھ کر بخوبی نظر آتا ہے۔ انہوں نے ہر صنعت کا استعمال اس طریقہ سے کیا ہے کہ وہ کلام میں تاثیر کا باعث بن گئی ہے۔

اگر ہم مجموعی طور پر شہزاد احمد کی نظموں کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی اس صفت یعنی صنعت مراعات النظیر پر غور کریں تو یہ بات نمایاں طور پر معلوم ہوتی ہے کہ اس صفت میں انہوں نے اکثر و بیشتر ایسے الفاظ کا استعمال کیا ہے انسانی اعضاء سے ہے، آنکھ، پاؤں وغیرہ۔ اس کا مطلب ہرگز نہیں کہ انہوں نے صرف انہی الفاظ پر اکتفا کیا مگر یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ ان کے ہاں اس صنعت میں مجموعی تاثر انہی الفاظ میں بھیگا ہوا نظر آئے مگر اس کے ساتھ ساتھ ہمیں قدرتی مناظر اور فطرت پر کہے ہوئے الفاظ میں بھی اس کا خوبصورت استعمال ملے گا۔

کسی واقع یا منظر کو اس طرح بیان کرنا کہ اس کی تصویر پر جس طرح شاعر کی نظر میں ہے ویسے ہی قاری کے سامنے بھی گھوم جائے۔ واقعہ نگاری کہلاتی ہے۔ اس واقعہ نگاری میں کوئی تاریخی واقعہ بھی بیان کیا جاتا ہے۔ یا آنکھوں دیکھے حال کو اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ایک مربوط شکل میں سامنے آجائے اور اردو ادب کے بہت سے شعرا ایسے ہیں جنہوں نے انتہائی خوبصورتی سے اس فرض کو نبھایا ہے۔ ان کی نظم "اپنی سالگرہ پر ایک نظم" اور "اجنبی کون ہے تو" اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ ایک میں کشمیر کے پس منظر حالات و واقعات تو دوسری میں خود کے جنم دن کے لیے استعارے کے ساتھ جنم دن کا بیان ملتا ہے۔ بچپن کا ذکر وغیرہ۔

"میری صناعی کا مداح زمانہ سارا
کھیتیاں، جھیلیں، مہکتے ہوئے باغ
چاندنی سے بھی شفاف مرپاؤں کی دھول
تجھ سے دوری مرا مقصود۔۔۔اصول
تیری قربت نہیں اک لمحہ قبول
تو دھواں زرد چٹانوں جیسا
سانس گھٹتا ہے مرا
اپنانا یا کہ بدن میری زمیں سے لے جا
مدتیں بیت گئیں تو نہ مجھے جان سکا
اجنبی کون ہے تو؟"(۳۶)

(اجنبی کون ہے تو، ص۱۶۶)

سنگم، زنداں، شل، پتھر اور پرندہ کی مانند ایسے الفاظ کا استعمال جابجا دیکھنے کو ملتا ہے اور یہ پتھر کوئی بھی ہو سکتا۔ انسان کا مجسمہ اور دیگر انواع کے پتھر اس میں تنوع کا عنصر پیدا کر کے اس کو مختلف جگہوں پر مختلف معنوں میں استعمال میں لاتے نظر آتے ہیں۔ کہیں انسانی اعضاء کو ان سب کی مانند قرار دیتے ہیں۔

"مگر یہ ہاتھ تو شل ہے
اب اس میں زور باقی ہے نہ کس بل ہے
مرے دو پاؤں میں بھی ایک پاؤں
سنگ کی مانند بے حس ہے
مگر میں نے سنا تھا
پتھروں میں جان ہوتی ہے
بہت سے پتھروں میں ایک پتھر
میرے دل میں بھی دھڑکتا ہے
میرے سینے کے زنداں میں
پرندہ سا پھڑکتا ہے"(۳۷)

(اکائی، ص۱۵۹)

شہزاد احمد کے ہاں موضوعات میں تنوع، نئے پن، حسنِ لطافت، معنوی تنوع اور فکری وفنی ہر لحاظ سے بنت کاری لفظوں کی یوں لگتا جیسے یہ لفظ بناہی اسی جگہ پر استعمال ہونے کے لیے۔ انتہائی خوبصورتی سے فنی پیرایوں میں بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ تو کہیں نقطوں کا برملا اظہار دکھائی دیتا۔ وہ نقطہ آغاز کسی چیز، کام کا مختلف سانچوں میں ڈھلا نظر آتا ہے۔

"میں نقطوں میں گھرا ہوں
ہر طرف نقطے ہی نقطے ہیں
کسی نقطے سے آغازِ سفر کرنا پڑے گا
کاش یہ نقطے
سمٹ کر ایک ہو جائے"(۳۸)

(اکائی، ص۱۵۹)

غرض یہ کہ مختلف زاویوں سے اپنے رستے کی دیواریں آسمان، زمین اور پہاڑوں وغیرہ کے حصار کا ذکر کیا۔ ہر جگہ یہ خواہش نمایاں کہ وہ انہیں عبور کر کے آگے بڑھ جائے۔

"ابھی تو نے دیکھا نہیں آسماں کی طرف
ابھی تو زمینوں کے ذروں میں مصروف ہے
ابھی تو نے سوچا نہیں
یہ ستارے بہت دور ہوتے ہوئے بھی
بہت پاس کیوں ہیں؟
ابھی چاند کا آئینہ اتنا شفاف کیوں ہے
زمیں اپنے سینے پہ کہسار کا بوجھ لادے
کدھر جا رہی ہے!
یہ جھیلیں جو گدلا چکی ہیں
سسکتی ہوئی زرد دھرتی سنا سو رہیں
اور یہ فصلیں جو اس وقت شاداب ہیں

کل جھلس جائیں گی
کل جو آیا نہیں
سب کی نظریں اسی پر لگی ہیں
مگر آج، جو آج ہے کتنا بے مایہ ہے‘‘(۳۹)

(ابھی تو نے دیکھا نہیں، ص ۱۵۵)

شہزاد احمد زمانے کی اس بے راہ روی پر نظر ڈالتے ہوئے دوسروں کو بھی اس سے آشنا کروانا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک زمانہ ایسا دھانے پر آکھڑا ہے جو پرانی روایات سے کنارہ کش ہو کر زندگی گزارنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ لوگ صرف عیش و عشرت کے عادی ہو چکے ہیں اور ان کے نزدیک کسی بھی چیز کی قدر و قیمت باقی نہیں رہی۔ تو ایسے لوگوں کے نزدیک مٹی کے پیالے کی کیا اہمیت اس کیفیت کو بھی وہ اپنی نظموں کا موضوع سخن بنائے دکھائی دیتے۔ اس قسم کی نظمیں پڑھ کر بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ کسی بھی واقعہ کو نظم کے سانچے میں ڈھال کر بیان کرنے میں مہارت رکھتے۔ وہ کسی بھی واقعہ کو اس طرح رقم کرتے ہیں کہ شروع سے لے کر آخر تک ایک مکمل کہانی کی صورت میں سارا واقعہ نمودار ہو جاتا ہے۔

شہزاد احمد شعور اور تلازمہ خیال کی طرح تجرید کو بھی ملحوظ خاطر رکھا۔ شاعر نے بحیثیتِ مجموعی ابلاغ کا خیال رکھا۔ بعض نظموں میں صورتیں، کیفیتیں اور خیالات آپس میں گڈمڈ ہو کر تاثر میں کمی آئی ہے۔

شہزاد احمد کے کلام میں قافیہ اور ردیف محض خانہ پوری کے طور پر مستعمل ہیں۔ لفظ خاص ہو یا عام جب ان کے کلام میں آتا ہے تو اپنے محل استعمال کا جواز فراہم کرتا ہے۔ ردیف میں بھی شاعر نے جدت کا تکلف سے کام لینے کی بجائے موقع محل کو دیکھتے ہوئے استعمال کی بنا پر فنی حسن کا اہتمام کیا۔

ساتھ ہی ان کے ہاں جگہ جگہ آشوب عصر، اقدار کے ضیاع اور تنہائی کے حوالے سے تشبیہات و استعارات نظر آتے ہیں۔

شہزاد احمد ذہن میں موجود صورت کو بنیاد بنا کر اپنے تجربے کو نظم کی صوتی سکیم کے حوالے کرنے کے وقت تخلیقی تجربے کے ذریعے خیال اور لفظ کے امتزاج سے نیا لب ولہجہ پیدا کرتا۔ جو کہ ایک خوشگوار آہنگ کی شکل میں صفحہ قرطاس پر سامنے آتا ہے۔ ایسے بہت سارے مقامات ہیں جہاں پر ان کی نظمیں نامیاتی آہنگ اور بحور کے مناسب استعمال سے از خود رفت کر دینے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ شاعر نے معاشرتی اور مشینی موضوعات کو بھی نظموں کے

سانچے میں پیش کیا۔ کہیں اس جہاں کی بے ثباتی اور اس کی نازیبا حالات و واقعات کا فنی اعتبار سے اظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں اور اس دنیا کی اونچ نیچ کا برملا اظہار کرتے۔

"یہ کیسا ٹوٹا پھوٹا سا جہاں تو نے بنایا ہے
جہاں اینٹیں نہیں ہیں
آگ کے گولے ہیں
جو اک دوسرے کے ساتھ جلتے ہیں
کوئی بائیں طرف جاتا ہے
اور پھیلے ہوئے ساکت خلا میں "(۴۰)

(وہ کیسا ٹوٹا بنتا جہاں ہے، ص ۸۳)

انسان کی زندگی اور اس فانی دنیا کی حقیقت اصل صرف ایک بلبلے کی مانند ہے۔

"تو کیا میں قید ہوں اک بلبلے میں!
مرے چاروں طرف پھیلی ہوئی نیلی دیواریں
نہ کوئی شکل رکھتی ہیں،
نہ ان میں کوئی خوشبو ہے
میں اک مٹی کے تودے پر کھڑا ہوں "(۴۱)

(ایک بلبلے میں، ص ۸۶)

شہزاد احمد کے ہاں ہر لفظ یوں لگتا ہے جیسے ایک ترتیب کے ساتھ لڑی میں موتی پروئے ہو۔ شہزاد احمد کا لب و لہجہ متنوع جہات کا حامل نظر آتا ہے۔ شہزاد احمد کی نظموں میں موضوعات میں طرح طرح رنگ تو دیکھنے کو ملتے ہی ہیں مگر ان رنگوں کا صحیح منفرد جامع استعمال ان ہی کا کمال ہے۔ خود سر بر سرِ پیکار نظر آتے۔ دنیا یہ جہاں مادیت پرستی کی جانب اس رفتار سے گامزن ہے کہ اپنے اصل سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ انتہائی فنی چابکدستی سے اس کی تصویر کشی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

"میں نے لوگوں سے کہا، "چپ ہو جاؤ"

شور اتنا تھا کہ میری آواز
میرے کانوں نے بھی شاید نہ سنی
لوگ مصروف تھے چلانے میں
ان کو لگتا تھا کہ وہ حشر تک
اپنی آواز پہ قابو نہیں پا سکتے
کوئی چپ ہونے کو تیار نہ تھا!''[۴۱]

(چپ ہو جاؤ، ص ۹۲)

شہزاد احمد نے موقع کی مناسب سے اور جہاں ضرورت محسوس ہوتی اور بات کو زیادہ واضح اور اس پر زور دینے کے لیے نظموں میں علامتوں کا بھی استعمال کیا۔ سوالیہ، ندائیہ، فجائیہ اور دیگر فنی پیرایوں میں ان سب کا استعمال عمدگی کے ساتھ نظر آتا۔

سفر کے لیے شہزاد کے ''نیند'' کا استعارہ استعمال ہوا ہے۔ سفر کوئی بھی ہو نیند کی طرح نیند میں ہوتا ہے۔

''مگر یہ اور ہی کچھ
مرا اپنا کوئی انداز، بہروپ ہے
کوئی بھیانک خواب ہے
میں نیند کے اندر سفر کرنے کا عادی ہوں
تو کیا سارا سفر پھر سے مجھے کرنا پڑے گا!''[۴۲]

(نیند میں سفر)

شہزاد احمد کے ہاں خود سے آشنائی کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔ وہ کبھی خود سے سوال کرتے اور خود کو چیونٹیوں کی مانند کہتے نظر آتے ہیں۔ انتہائی خوبصورت سے فنی پیرائے میں موضوعات کو بیان کرتے نظر آتے ہیں۔

''مجھ کو یہ تو فکر نہیں، میں کون ہوں؟
کیوں تخلیق ہوا ہوں؟''

ان کے ہاں نظموں میں فلسفیانہ انداز جھلکتا ہے۔ ان کا اسلوب کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ جدید رنگ ڈھنگ رکھنے والے اور سائنس و فلسفیانہ انداز بھی نظموں میں اپنائے نظر آتے ہیں۔ ان کا ایک مخصوص دائرہ فکر ہے۔ جو ان

کی شاعری کو ارتقا بخشنے میں دوسرے شعرا سے منفرد کرتا ہے۔ انہوں نے روایتی انداز کے موضوعات سے متاثر ہو کر عصری تقاضوں کو نظر انداز نہیں کیا۔ ان کے جذبات واحساسات نسائیت آمیز بھی ہے۔ جن سے ایک اپنائیت کا احساس جھلکتا ہے۔ عشق مجازی کے ساتھ ساتھ عشق حقیقی کی جھلکیاں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ''موم بتی'' کا لفظ شہزاد کے ہاں نظموں میں متنوع جہات میں استعمال ہوئی۔

''میں اس موم بتی کی طرح ہوں
جسے روشن کیا جاتا نہیں
پھر بھی وہ کمرے کی حرارت سے پگھل جاتی ہے
بس دھاگا ہی رہ جاتا ہے''[۴۳]

(موم کا دھبّا، ص ۱۰۴)

''میرے چاروں جانب یہ پھیلے ہوئے جنگل، صحراا ور سمندر
اتنی مہلت ہی کب دیتے ہیں
میں اپنے بارے میں سوچوں!''[۴۴]

(سب سے بڑی حقیقت، ص ۹۸)

اس جہاں کی فرسودگی اور اس کے ہاں اخلاقی گراوٹ کی کمی اور کشمکش میں گھرے ہوئے کہیں کوئی صورت نہیں کہ اچھائی کی یا یہ جہاں اور آدمی جو کہ مشین بن چکا ہے۔ سب کے سب یوں لگتا آئینے دھندلا چکے ہوں۔

کوئی آسودگی باقی نہیں ہے
کوئی موجودگی باقی نہیں ہے[۴۵]

(کوئی صورت نہیں، ص ۱۰۱)

ان کے ہاں نظموں میں تسلسل اور ربط وضبط پایا جاتا ہے۔ ان کے خیالات قاری کو اپنی آغوش میں لے لیتے ہیں۔ اس کے باعث وہ کئی طرح کی دلچسپیوں سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔ ان کا پیرایہ اظہار انتہائی دلفریب ہے جو اپنے ایک نئی فضا رکھتی ہے۔ ان کے ہاں دعوت غور وغم کے اثرات ہویدا ہے۔

''تو کیا میں پودا ہوں؟

یا پرندہ ہوں یا درندہ ہوں

یا خزندوں کی نسل سے ہوں

میں جو بھی کچھ ہوں

خود آگہی کی اداس رت میں

گھرا ہوا ہوں‘‘(۴۶)

(پہچان، ص۱۱۵)

شہزاد احمد کی نظموں میں کائنات اور اس سے اسرار رموزنت نئے رنگ ڈھنگ میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ تو کہیں کائنات کو کھلونا کی مانند قرار دیتے۔

’’کائنات ایک کھلونے کی صورت مرے ہاتھ آئے گی

اور اگر آگئی

تو کھلونا کہاں تک میرا ساتھ دے گا

کوئی صورت نہیں ہے کہ میں

اس کھلونے کو محفوظ رکھوں‘‘(۴۷)

(اے خدا، ص۱۲۹)

آنکھوں کا استعارہ ان کی نظموں میں مختلف لب ولہجے سے دیکھنے کو ملتا ہے۔

’’اپنی آنکھیں دیکھتی رہتی ہیں باہر کی طرف

اور اندر کی طرف سے بند ہیں

اس قدر پابند ہیں

دیوار کی صورت کھڑی ہیں‘‘(۴۸)

(آ،اداس کی روح میں اترے، ص۱۴۴)

وہ اپنے ذاتی خصائص کو قدرت سے منسوب کرتے ہیں۔ ان کے ادراکات کائناتی نوعیت کے ہیں۔ ان کے کلام میں صالع عالم کے حسیں جلوے نظر آتے ہیں۔ اندھیرے، اجالے، شب و روز، شام و سحر، فضاؤں، کہکشاؤں، فلک، ستاروں، گلستاں اور بیابیاں میں انہیں ذاتِ حقیقی کے جلوے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے ہاں معاشرہ، سیاست، مذہب اور

فطرت کے موضوعات عمدگی سے پائے جاتے ہیں۔ ہر موضوع پر نظم میں طبع آزمائی کی۔ ان کا اسلوب دنیائے ادب میں بہت عمدہ ٹھہرا۔ وہ سادگی میں بھی معنویت کا منبع نظر آتا ہے۔

محبت کا موضوع شہزاد کی نظموں میں انتہائی چابکدستی سے اور دلفریب پیرائے میں جگہ جگہ بیان ہوا ہے۔ کبھی محبوبہ سے دور اور تنہائی اور خیالات کی دنیا رنگین دنیا میں مسحور نظر آتے ہیں۔

"فقط لب ہیں
جو شاید چاہتے ہیں میں انہیں چوموں
انہی کے راستے اس روح میں اتروں
جسے جڑے زمانہ ہو چکا ہے
یہ قصہ اب پرانا ہو چکا ہے" (۴۹)

(وہ مجھ سے کچھ تو کہنا چاہتی ہو گی، ص ۱۱۱)

شاعر کلام کو خوب تر بنانے کے لیے جا بجا استعارہ تشبیہات سے کام لیا زندگی کے المیوں اور انسانوں کی بے حسی کے لیے انسانوں کو پتھروں سے تشبیہ دیتے ہیں۔

پتھروں میں مورتیں ہیں
مورتوں میں جان ہے
روشنی اس تیرگی میں اس قدر ہے۔ میں حیران ہے (۵۰)

(سنگ ریزے، ص ۱۶۱)

ان کی نظم درد درد آشنا روح کی داستانیں ہیں۔ زیادہ تر نظموں میں اضطراب حیات نظر اتا ہے اور یہ اس طرح اپ کا بھی افسردہ معاشیت کا تو کبھی بھوکی معاشرت کا۔ شاعر نے جربات و مشاہدات کو بڑی فنی مہارت سے نظموں کے قالب میں ڈالا۔ ان کی نظم طرز فکر، طرز بیان کا حسن اور خوبصورت امتزاج ہے۔ شہزاد احمد نے صنائع لفظی و معنوی کے بیان سے کلام میں دلکشی پیدا کی۔ ان کی نظموں کے موضوع سخن نہایت نازک وحساس ہے۔ نظموں میں تصنع و بناوٹ کا نشان نہیں ملتا۔ نظموں میں الفاظ کا صوتی حسن، زبان کی سیاست اور صنائع شعری۔ کی بعض نظموں میں جو ہیت اختیار کی وہ نثری نظم کے قریب تر۔ انہوں نے ان مسائل کو جو عہد حاضر کے انسان کی گھٹن کا سبب بنے۔ اپنی نظموں میں بڑے پرجوش اور جارحانہ انداز میں پیش کیا ان کی شعری یری دنیا ان کی اپنی مخصوص طرز فکر سے عبارت دکھائی دیتی ان کے

نظم گوئی اپنے منفرد اسلوب، تازہ لہجے، صداقتِ اظہار کی بدولت مستقبل کی نظم نگاری میں آسانی حثیت کی علمبردار ہے۔ شاعر نے جس خوبصورتی سے اپنی نظم کو فکری اعتبار سے مزین کیا۔ اسی خوبصورتی سے فنی اور اسلوبیاتی لحاظ سے بھی کلام کو معطر کیا۔ نظم میں موضوعات کو بڑی وضاحت سے بیان کیا۔ اپنی اہنگی سے اس میں دلکشی اور تحسین پیدا کر دی۔ انہوں نے کم و بیش تمام فنی اصطلاحوں کو اپنے کلام میں استعمال کیا۔ نظم جدید کی تمام اصناف کو انہوں نے دلفریب انداز میں استعمال کیا انہوں نے عام بول چال کی زبان استعمال کر کے کلام میں خوبصورت اہنگ پیدا کیا۔ شاعری میں استفہامیہ انداز ایک قدیم روایت ہے اس سے بڑا شاعری میں سوالیہ کیفیت پیدا کرنا یہ اصطلاح خالصتاً فنی ہے۔ کیوں، کہاں، کب اور کیسے وغیرہ کے الفاظ کا استعمال کر کے کلام میں استفہامیہ اہنگ پیدا کیا جاتا ہے۔ جس نے نہ صرف فنی خوبصورتی پیدا ہوتی بلکہ اشعار میں ایک الگ معنویت بھی پیدا ہوتی ہے۔

میں کس ہیولے کے درمیاں ہوں
میں گرد رہ ہوں کہ کارواں ہوں
چھپا ہوا ہوں کہ میں عیاں ہوں!
یہ گتھیاں کس طرح میں کھولوں؟
میں کیسے خود پر یقین کر لوں؟[۵۱]
(مگر میں کیسے یقین کر لوں، ص ۱۶۰)

وادیاں، کہسار، دریا
کن مقاصد کی علامت ہیں؟
ستارے چاہتے کیا ہیں؟
زمین پر اگ برساتا ہوا سورج کہاسے آ گیا ہے؟
یہ ستارے بہت مجبور کیوں ہیں![۵۲]
(مرے مرنے سے پہلے، ص ۱۳۱)

ان کے کلام میں پیچیدگی اور بھیجا توالت موجود نہیں انہوں نے عام بہت چال کی زبان کو استعمال کر کے کلام میں خوبصورت آہنگ پیدا کیا۔ ان کی نظم فکری و فنی انفرادیت کو اپنے موضوعات اور تکنیک کے حوالے سے ثابت

کرتی ہیں۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ یہ چھوٹے چھوٹے احساسات، واقعات اور اشوب تفصیل کے متقاضی ہیں۔ ان کو اگر غزل کے ایک ہی شعر میں بیان کرنے کی کوشش کی جاتی تو اتنا واضح اور تمام خدوخال نمایاں نہ ہو پاتے۔ اور ان کی اصل صورت مسخ ہو کر رہ جاتی۔ لہٰذا ان کے تمام خدوخال کو نظم میں ہی مکمل طور پر بیان کیا جا سکتا اور دیکھا جا سکتا ہے۔ یہی نہیں انداز کے نظمیں بھی شہزاد احمد کے ہاں مجموعے میں موجود ہیں۔ اور سوال کرتے دکھائی دیتے کہیں پر خود سے تو کبھی معاشرے کی ناانصافیوں تو کبھی اپنوں کے ظلم و ستم کا سوال کرتے کہیں پر محبوب سے ہمکلام ہوتے ہوئے سوالیہ لب ولہجہ نظر اتا ہے۔

تم کیا کہتے ہو؟
کیا انسان بڑا ہے یا تاریخ بڑی ہے؟
کیا انسانوں نے تاریخ بنائی ہے؟
یا تاریخ نے انسانوں کو بنایا ہے؟
یاں شاید تخلیق کیا ہے؟
کیا پہلے رات اتی ہے یا دن آتا ہے؟
پہلے کیا ہوتا ہے اور بعد میں کیا ہوتا ہے؟
اتنے سوال کہاں سے آتے ہیں؟(۵۳)

(تم کیا کہتے ہو، ص ۱۴۳)

ان کی نظموں میں سوالیہ انداز ہر رنگ اوڑھے ہوئے ہیں۔ وہ سوال تو کرتے ہیں خود سے فطرت سے مگر وہیں پر سوال کو مختصر اور جامع انداز میں کرتے ہیں کہ بوجھل پن محسوس نہیں ہوتا۔

کیا ہم پھر سے بنائے جائیں گے؟
کیا کوئی اور آدم بھی آئے گا؟(۵۴)

(تم کیا کہتے ہو، ص ۱۴۴)

کشمیر بڑے صغیر پاک و ہند کا شمال مغربی علاقہ جو کہ دونوں ملکوں کے مابین سنجیدہ تنازعہ بنا ہوا ہے۔ اور ہندوستانی فوج نے اس پر قبضہ کر لیا۔ اور کشمیری مسلمانوں پر اب تک ان گنت وہ پہاڑ توڑے جس کی مثال دنیا میں نہیں ملتی۔ شاعر نے اپنی اندرونی کیفیت کو بیان کیا ہے۔ اور جس میں انہوں نے کشمیر کو ازاد کرانے کے عزم کی بات کی ہے۔

اور کشمیر کی حسین وادیوں کو خوبصورتی کو نہایت فنی پرائیوں میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ ان کے رہن سہن کو ماشرتی وسماجی اقدار وروایات خاص کر وہاں کی خوبصورتی سے ہمکلام ہوتے نظر آتے ہیں۔

میری صناعی ئی کا مداح زمانہ سارا
کھیتیاں، جھیلیں، مہکتے ہوئے باغ
چاندنی سے بھی ہے شفاف میرے پاؤں کی دھول
تجھ سے دوری میرا مقصود۔۔۔اصول
تیری قربت نہیں ایک لمحہ کا قبول
تو دھواں زرد چٹانوں جیسا سانس گھٹتا ہے میرا
اپنا ناپاک بدن میری زمین سے لے جا
مدتیں بیت گئیں تو نہ مجھے جان سکا
اجنبی کون ہے تو؟(۵۴)

(اجنبی کون ہے تو، ص۱۶۷)

شاعر کے ہاں زندگی کے بڑے بڑے واقعات، سانحے، سیاسی، سماجی مدو جزر، جمالیاتی تجربات اور عشق کی کیفیت نظم کا موضوع ہے۔ اور دلکش لفظیات دو طرح کی مدد سے خوبصورت نظمیہ ماحول بھی تخلیق کرتے ملتے ہیں ان کے ہاں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے چھوٹے چھوٹے احساسات نظموں کے سانچے میں ڈھل گئے ہو۔ ان کی نظموں میں موضوعات میں تسلسل نظر آتا ہے۔

ان کی نظموں میں معاشرتی ناہمواریوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اور اس کے علاوہ کچھ سیاسی و سماجی نامور شخصیات کو خراج عقیدت بھی پیش کرتے ہیں۔ جیسے کہ قائداعظم کے نام ان کی نظم نہایت فنّی انداز اپنائے اور خوبصورت پیرائے میں بیان کی گئی۔

چلو کہ پھر اسی خوشبو کے راستے پر چلیں
وہ ارزو ہو کے جس کا سفر تمام نہ ہو
وہی صدا نئی صورت کے روپ میں جاگے
اسے تلاش کروں جس کا کوئی نام نہ ہو
پھر آسمان پہ آ، اے گئے ہوئے سورج

نصیب ہو وہ سحر جس کی کوئی شام نہ ہو
دوام ہو مری مٹی بھی، اس کی خوشبو بھی
شجر جو تو نے لگایا صدا ابھلے پھُولے
تیرے ہی عزم کی قندیل ہاتھ میں لے کر
چلے تو تیرا مسافر نہ راستہ بھولے زمین سے تا بہ فلک
سلسلہ رہے قائم زمین کا یہ شجر آسماں کو چھُولے (۵۵)

(سفر تمام نہ ہو، ص۸۹۷)

ان کی نظمیں ان کے گہرے فکری وفنی شعور کا پتہ دیتی ہیں۔ اور وہیں پر ان کی نظمیں ارباب اختیار کے لیے ایک سوال ہیں۔ جس کا وہ ان سے جواب چاہتے ہیں۔ عوام کی بات کرتے، عوام کے دل کی بات کرتے، انسانیت کو بھائی چارے کا درس دیتے، لہجے کی نرمی اور انداز بیاں کی دلکشی نے اپ کی نظموں کو چار چاند لگائے۔

شہزاد احمد کی نظمیں سماجی قدر و قیمت میں اعلی مقام رکھتی ہیں۔ اپ اپنی بات بڑی سادگی اور شاعرانہ بے ساختگی کے ساتھ کہنے کا ہنر جانتے تھے۔ واقعات و مناظر کی تصویر کشی نہایت فنکارانہ انداز میں کرنا ہی دوسروں سے ممتاز کرتی آپ کی نظموں کو۔ اپ نے جدید اردو نظم کو فروغ دیا۔ اور اس کے علاوہ دیگر اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کی۔ علامتی انداز کی نظمیں بھی انھی کی خاصیت ہیں۔ ان کی نظموں میں مختلف سنتوں کے بر محل استعمال اشعار کو دیدہ زیب بنا دیتے ہیں۔ اور کمال کی بات یہ ہے کہ پڑھتے وقت احساس بھی نہیں ہوتا کہ بیان و بدیع کے کیسے کیسے رنگ پیچیدہ دقیق نکتے اظہار میں ارہے ہیں۔ شعری اسلوب نہایت سلیس، عام فہم اور سادہ۔ ان کی نظموں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ انہوں نے ہر نظم کے بعد تاریخ بھی درج کی۔ اور اگر دیکھا جائے تو مجموعی انداز احساس آمیز نظر اتا ہے۔

آزاد احمد کبھی زندگی سے ہم کلام ہوتے بھی نظر اتے ہیں کوماشہزاد احمد کے ہاں موضوعات کا پھیلاؤ ان کے اس مجموعے کے نام سے ہی واضح نظر اتا ہے، صدیوں، سالوں پر محیط حالات وواقعات اور اقدار وروایات نے عہد کے سیاسی وسماجی اتار چڑھاؤ، اپنوں کی بے رخی اور پھر سوالیہ لب ولہجہ، اسلوب کی دلکشی، فکری تنوع، فنّی مہارت سازی سب کے استعمال نے مل کر ان کی نظموں کو اوجِ کمال تک پہنچایا۔ اور ادب میں اپنا ایک مقام و مرتبہ بنایا

"ان کی نظمیں لفظیاتی پھیلاؤ میں مختصر ہیں۔ لیکن معنوی طور پر نہ صرف اس سیارے اور اس پر موجود زندگی کی تقدیر پر غور و فکر پر مسائل کرتی ہیں۔ بلکہ ان

کی نظم کو نظر انداز کرنے کی بجائے اس پر بارِ دِ غور کرنا چاہیے۔ اور جدید اردو نظم
کے ارتقائی سفر میں ان کی حیثیت متعین کرنی چاہیے۔"(۵۶)

شہزاد احمد ہمارے دور کے نمائندہ شاعروں میں سے ہیں۔ انہوں نے ساری زندگی شاعری کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا ان کی شاعری خاص کر نظموں کے مطالعہ لیتے ہوئے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کے اثبات کے سوا ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں رہتا۔

شاعری میں فکری لحاظ سے جہاں منفرد کھائی دیتے ہیں وہیں فنی اعتبار سے بھی ان کا کلام یعنی نظمیں خاصے کی چیز ہے۔ اشعار کی پیشکش میں جان اور شان پیدا کرنے کے لیے استفہامیہ انداز کہیں بھرپور ملتا ہے، ان کے ہاں تشبیہات و استعارات کا استعمال بھی ان کے وسیع المشاہدہ ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ ان کی نظموں کی زبان سہل اور سادگی میں پرکاری کا جادو رکھتی ہے۔ اس نے اپنے اندر وسیع تر امکانات رکھے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ نظمیں اور قطعات بھی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ شعری افق پر نمودار ہے۔ اس طرح تلمیح، استفہامیہ لہجہ، سنت مراعات النظیر اور دیگر شعری صنعتوں کو بر محل خوب برتا۔

موضوعات ماحول سے کشیدہ کیے گئے۔ شاعر جو محسوس کرتا ہے۔ انہیں زبانِ شعر میں قرطاس پر منتقل کر دیتا ہے۔ اور اس کا ہنر خوب جانتا ہے۔ ان کی نظمیں اپنے الگ رنگ ڈھنگ میں ڈھلی اور اُردو ادب کی تاریخ نظم کے پیرائے منفرد لب و لہجے کے ساتھ رواں دواں نظر آتی ہے جو آپ کو بھی الگ مقام و مرتبہ پر فائز کرتی دکھائی دیتی ہے۔ فنی۔ ان کے تمام مجموعوں میں فنی جہتوں کی کمی نہیں۔ زبان کے اعتبار سے اور جملوں کے استعمال کرنے کا بہترین ہنر شہزاد احمد کی نظموں میں ہمیں دکھائی دیتا ہے۔ فکری اعتبار سے اور فنی پہلوؤں سے لبریز ان کی نظمیں اس بات کا ثبوت ہے۔ شہزادہ مرد کی نظموں کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح نظر اتی ہے کہ انہوں نے اپنے نظموں میں انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو خاطر میں لائے۔ وہ دکھ اور غم کو اس انداز میں بیان کرتے ہیں کہ انسان کو زندگی کی حقیقت کو سراغ ملتا ہے۔ زندگی کی گفتگی کے لیے عشق و محبت اور خوشی کے پہلو کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، فطرت کے عناصر کو بھی اپنی شاعری کی زبان و لفظیات کو بہت خوبصورتی سے جگہ دیتی ہے۔ فنیا والے سے اگر دیکھا جائے تو اپنی نظموں میں مکالماتی انداز اور خود کلامی جیسے اوصاف کے ساتھ ساتھ تشبیہات و استعارات، رموز اور تمثالوں کا بھی نہایت خوبصورتی سے استعمال کرتے۔ اور قومی موضوعات پر بھی نظمیں تحریر کی ان کے جذبہ حب الوطنی اور موثر سیاسی صورتحال سے اگاہی کی دلیل ہے۔ جو ان کی موضوعاتی بو قلمونی ہونے کی عکاس ہے۔ تو وہ بیان کرنا چاہتے ہیں تو ایسا ہی منظر تراش کر

قاری کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ انہوں نے صنعتِ تلمیح، صنعتِ النظیر، صنعتِ لف و نشر غرض یہ کہ اپنے کلام کو صنائع وبدائع کی چاشنی سے چار چاند لگائے۔ آپ نے قطعات بھی تحریر کیے۔ جو کہ نہ صرف آپ کی فکری مہارت گری کا بلکہ فنّی انداز بیاں کا ثبوت ہے۔ اور ان کے مطالعہ سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے زیست کے تجربات کو قطعات میں سمو رہے۔ وہی پر ان میں محبت کی چاشنی بھی ملتی، حسن لطافت بھی اور زندگی کے تجربات کا بیان بھی ملتا۔ انھوں نے مشکل اور آسان دونوں طرح کی تراکیب استعمال کی۔ یہاں پر انہیں مکمل عبور حاصل تھا۔ وہ سکہ بند کافیوں کی بجائے نئے نئے قافیت تراشتے ہیں۔ اور زبان ص بیان کی یہی قدرت انہیں منفرد مقام دلاتی۔ تو کہیں پر غم میں دوڑا کی تمام صور تحال کو لفظوں کے جادوگری سے تصویری مناظر بنادیا ہے۔ ساتھ ہے میں نے اردو زبان میں نظم میں اپنے خیالات کے ترجمانی کرتے ہیں دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ایک نظم نگار کے روپ میں سامنے آئے ان کی نظمیں فنّی اور فکری لحاظ سے نظم کے معیار پر پوری اترتی ہیں۔ نہ صرف یہی بلکہ میرے رزق کی تقسیم اور محبت کے موضوع کو عمدہ الفاظ کا لباس پہنا کر نظم کے قالب میں ڈھالا۔ کی نظموں میں لفظ و معنی کے کئی پرتیں واہ ہوتی ہیں۔ تہہ داری اور معنی آفرینی ان کی نظموں کا حسن ہے۔ تخیل موضوعات کو نکھار تا ہے اسی طرح وہ فنی محاسن کے بھی کئی لوگوں نے پیش کرتا ہے انہوں نے نظر روایتی تراکیبوں سے نئے نئے موضوعات کے لیے نہیں نئی تراکیب واضح کی۔ بلکہ ان کو ایک نئے رنگ ڈھنگ میں بیان کیا۔ ان کی نظموں میں مجموعی فضا انسانیت اور ملک کو قوم سے محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ فنّی سطح پر ان کی مہارت قابلِ داد داد ہے۔ اور ہر نظم کہنے کا اپنا انداز ہے۔ جس سے ان کی ادبی خدمات اور اہمیت واضح ہے۔

حوالہ جات

۱. اسد عباس عابد، غزل گو شہزاد احمد، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۸ء، ص ۱۹۰
۲. ایضاً، ص ۲۳۸
۳. شہزاد احمد، دیوار پہ دستک، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء، ص ۶۲۶
۴. شہزاد احمد، ٹوٹا ہوا پل، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء، ص ۱۷۷
۵. شہزاد احمد، دیوار پہ دستک، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء، ص ۱۰۰۳
۶. شہزاد احمد، دیوار پہ دستک، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء، ص ۸۳۹
۷. شہزاد احمد، دیوار پہ دستک، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء، ص ۱۰۲۷
۸. اسد عباس عابد، غزل گو شہزاد احمد، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۸ء، ص ۲۱۱
۹. شہزاد احمد، دیوار پہ دستک، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء، ص ۶۳۸
۱۰. ایضاً، ص ۶۴۴
۱۱. شہزاد احمد، دیوار پہ دستک، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء، ص ۸۵۷
۱۲. شہزاد احمد، دیوار پہ دستک، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء، ص ۸۹۷
۱۳. ایضاً، ص ۸۰۷
۱۴. ایضاً، ص ۸۱۸
۱۵. ایضاً، ص ۸۲۶
۱۶. ایضاً، ص ۸۳۴
۱۷. ایضاً، ص ۱۰۰۵
۱۸. اسد عباس عابد، غزل گو شہزاد احمد، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۸ء، ص ۱۹۵
۱۹. گلزار جاوید، انٹرویو، براہ راست، مشمولہ: "چہار سو"، جنوری، فروری، ۲۰۰۹ء، راول پنڈی، ماہ نامہ، جلد ۱۸، ص ۲۲
۲۰. شہزاد احمد، دیوار پہ دستک، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء، ص ۱۰۱۳
۲۱. ایضاً، ص ۱۰۲۷
۲۲. شہزاد احمد، آنے والا کل، لاہور: ملٹی میڈیا افیرز، ۲۰۰۵ء، ص ۱۹۵

۲۳۔ شہزاد احمد، آنے والا کل، لاہور: ملٹی میڈیا افیرز، ۲۰۰۵ء، ص ۱۹۵

۲۴۔ ایضاً، ص ۱۹۷

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۹۹

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۸۳

۲۷۔ ایضاً، ص ۱۸۸

۲۸۔ ایضاً، ص ۱۹۱

۲۹۔ شہزاد احمد، آنے والا کل، لاہور: ملٹی میڈیا افیرز، ۲۰۰۵ء، ص ۲۱۱

۳۰۔ شہزاد احمد، ایک چراغ اور بھی، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، ص ۱۸۳

۳۱۔ ایضاً، ص ۱۸۸

۳۲۔ شہزاد احمد، ٹوٹا ہوا پل، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء، ص ۱۴۷

۳۳۔ شہزاد احمد، ٹوٹا ہوا پل، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء، ص ۱۶۱

۳۴۔ شہزاد احمد، ٹوٹا ہوا پل، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء، ص ۱۵۴

۳۵۔ ایضاً، ص ۱۶۶

۳۶۔ ایضاً، ص ۱۵۹

۳۷۔ ایضاً، ص ۱۵۹

۳۸۔ ایضاً، ص ۱۵۵

۳۹۔ شہزاد احمد، مٹی جیسے لوگ، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء، ص ۸۳

۴۰۔ شہزاد احمد، مٹی جیسے لوگ، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء، ص ۸۶

۴۱۔ ایضاً، ص ۹۲

۴۲۔ ایضاً، ص ۹۵

۴۳۔ ایضاً، ص ۱۰۴

۴۴۔ ایضاً، ص ۹۸

۴۵۔ ایضاً، ص ۱۰۱

۴۶۔ ایضاً، ص ۱۱۵

۴۷۔ ایضاً، ص ۱۲۹

۴۸. ایضاً، ص ۱۴۴

۴۹. شہزاد احمد، اربوں سال کی دوری، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء، ص ۱۱۱

۵۰. شہزاد احمد، ٹوٹا ہوا پل، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۰، ص ۱۶۱

۵۱. شہزاد احمد، اربوں سال کی دوری، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳، ص ۱۶۰

۵۲. ایضاً، ص ۱۳۱

۵۳. ایضاً، ص ۱۴۳

۵۴. ایضاً، ص ۱۴۴

۵۵. شہزاد احمد، ٹوٹا ہوا پل، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۰، ص ۱۶۷

۵۶. شہزاد احمد، دیوار پہ دستک، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱، ص ۸۹۷

۵۷. شہزاد احمد، اربوں سال کی دوری، (ابتدائیہ)، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳، ص ۱۶

ماحصل

شاعری باذوق لوگوں کا سرمایہ ہے۔اور چشمِ دل سے کائنات کے زاویوں کو دیکھنے کا نام شاعری ہے۔ یہ ایک ایسی بساط کی مانند ہے۔ جس پر لفظوں کی طاقت سے کوئی بھی مہرہ چلایا جاسکتا ہے۔اور ایک ایسا نگر جہاں قدرت تخیل سے لفظ و معنی کے گوہر سے شعروں کی مالا پروئی جاتی ہے۔ایک شاعر اپنی شاعری کے ذریعے اپنے پورے معاشرے کی نمائندگی کرتا ہے۔ان میں چند ایک اپنے فن کی بدولت شہرت و نیک نامی کہ مستحکم ٹھہرے تو کچھ اپنے زمانے میں انا، خودداری، سادگی اور عاجزی کی بدولت گمنام رہے۔ اور وقت گزرنے کہ ساتھ ساتھ ان کے ادبی کارنامے نمایاں رنگ لائے اور ایک اچھا شاعر ہونے کے لئے کلام کا موزوں ہونا اہمیّت نہیں رکھتا۔ جتنا کہ اعلیٰ خیال اور اعلیٰ خیال کا طریقہ کار ہو شاعر اپنے عہد سے متاثر ہوتا ہے ہے۔لہٰذا وہ اپنے عہد کے معاشرے کے سماجی و سیاسی، تہذیبی،اور اپنی اقدار وروایات سے ہو کر ہی اپنے جذبات و احساسات کو اجتماعی طور پر بیان کرتا ہے۔۔وہ لوگ جو زندگانی کی ناقابلِ برداشت اذیتوں کو خود برداشت کرکے دوسروں کی خوشیوں کے متلاشی ہوتے ہیں۔ شہزاد احمد بھی ایسے لوگوں میں سے ایک ہے۔ جنھوں نے زندگانی کی تاریک راہوں میں اپنے حصے کا دیا جلانے کا کوشش کی۔ اور دوسروں کے دکھ درد کو اپنا سمجھ کر شاعری میں سمونے کی کوشش کی۔ جنھوں نے اپنی زندگی کے تنگ و تاریک پہلوؤں کو اپنی ذات پر حاوی نہیں ہونے دیا۔اور خود اندر ہی اندر ان سب کو دیکھتے اور برداشت کرتے رہے۔ آپ نے سائنس اور فلسفہ کا علم حاصل کرر کھا تھا۔ ان علوم پر آپ کو کافی عبور حاصل تھا۔ آپ نے نہ صرف غزل، نظم میں طبع آزمائی کی۔ بلکہ آپ نے نثری کتب بھی تحریر کی۔ اور تراجم بھی کیے۔ سائنسی موضوعات سے ابتداء ہی سے شغف تھا۔ اور جسکا اظہار ان کے مجموعوں کی نظموں سے بخوبی نظر اتا ہے۔ جہاں پر انھوں نے نثر، غزل میں اپنا ایک الگ مقام بنایا۔ وہی پر نظم کے میدان میں بھی برسرِپیکار رہے۔ اور نظم نگار شعراء کی فہرست میں اپنی ایک الگ پہچان بنائی۔ اپنے عہد میں رہتے ہوئے اپنے مزاج اور جانچ پرکھ و محسوسات کو لفظی سانچوں میں ڈھالا۔ تاہم بعض شعراء کی فنّی بصیرت اور تکنیکی مہارت نظم کی پوشاک پر وہ گل کاریاں کرر ہی تھی۔ جن کی مثال تاریخ میں ملنا محال ہے۔ اور شعراء کے مابین اپنی ایک منفرد پہچان کے حامل شاعر شہزاد احمد ہے۔ جو کہ ۱۶ اپریل ۱۹۳۲ کو امرت سر میں پیدا ہوئے۔ آپ کو شاعری سے لگاؤ بچپن ہی سے تھا۔ سات سال کی عمر میں پہلی بار نظم کہی۔ اور بڑے بھائی کی سرپرستی میں یہ شوق آپ کا اور بھی مضبوط ہوتا گیا۔ بے شمار مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اور دکھوں کہ تو جیسے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہو۔ باب کا سایہ سر سے اٹھ جانا اور پھر بڑے بھائی کی

موت کا، جلاوطنی اور ہجرت پھر غمِ روزگار کی تلاش ان سب کا آپ کو سامنا کرنا پڑا۔ ان سب دکھوں کے بعد آپ کو ایک نئی زندگی ملی۔ آپ نے موت اور زندگی کو اتنے قریب سے دیکھنے جاننے کے بعد اس احساس و تجربہ کو شاعری کی صنف نظم میں ڈھالا۔ اور ایک مکمل شعری مجموعہ ٹوٹا ہوا پل منظر عام پر آیا۔ یہ مجموعہ اس کی غزلیں اور نظمیں سب اسی کی روداد معلوم ہوتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے یہ ایک وقت میں شاعری، موت اور زندگی کی کتاب ہو۔ وسیع المطالعہ، عمیق نظر اور حالات واقعات اور تجربات نے آپ کی فکر کو اور وسعت عطائیں۔ اور آپ نے اٹھارہ شعری کی مجموعے غزلوں، اور نظموں پر مشتمل تخلیق کیے۔ جو کہ مندرجہ ذیل ناموں سے شائع ہوئے اور پانچ شعری مجموعوں پر مشتمل مجموعہ "دیوار پہ دستک" کے نام سے شائع ہو۔ دیگر مجموعوں میں "معلوم سے آگے"، اُترنے میری خاک پر ستارہ"، "کون اُسے جاتا دیکھے"، "پیشانی میں سورج"، "ٹوٹا ہوا پل"، "اربوں سال کی دوری"، "آنے والا کل"، "ایک چراغ اور بھی"، "مٹی جیسے لوگ" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ یہ کتابیں فن شاعری میں ان کا مقام و مرتبہ متعین کرتی ہیں۔ نظم میں اپنا ایک خاص مقام بنایا۔ اور نظم کے میدان میں جدت اور نظم کو متنوع موضوعات سے ہمکنار کیا۔ جہاں تک ان کی نظموں کا تعلق ہے۔ ان کا موضوعاتی سیاست سے معاشرت تک اور مشیت سے میصت تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے ہاں داخلیت کا اظہار بھی ہے۔ اور خارجیت کا اقرار بھی۔ کہی غلامی کی کسک بھی ہے۔ یادرفتگاں بھی ہے۔ سہانے خواب بھی ساتھ ہی شکست خواب بھی۔ مایوسیوں کا اندھیرا بھی اور یاس کا اُجالا بھی۔ اور مجموعی طور پر نظموں کے مطالعہ سے ہوتا ہے کہ عصری آگاہی اور سماجی شعور پر ہے۔ اور کچھ نظمیں تو سائنس سے وابستہ گہرے لگاؤ کی بدولت سائنسی شعور کا نمونہ معلوم ہوتی ہے۔ مگر موصنوع میں کہی پر یکسانیت نہیں دیکھنے کو ملتی۔

کچھ نظمیں تو سائنسی شعور کی عکاسی کرتی ہے۔ ان میں زندگی، اور اخلاقی گراوٹ، سیاسی و سماجی، معاشی و معاشرتی عوامل کا عمل دخل مشینیت نُما انسانی زندگی اور انسان ہے۔ شہزاد احمد جدید دور کے جدید شاعر ہے۔ جو سماج اور نئی نسل کے بہترین عکاس ہے۔ انہوں نے اپنی نظموں میں موجود مادیت پرستی کے متحمل سماج کے انسانوں کی مشینیں محبت کو خصوصی طور پر موصنوع بنایا۔ اپنے مطالعہ، مشاہدات اور جذبات واحساسات کے ساتھ اپنی منفرد پہچان رکھتے ہے۔

شہزاد احمد کا فکری حوالہ ہے وہ اپنے گرد وپیش پھیلے ہوئے سماجی وسیاسی، قلبی واردات کا بیان اور اخلاقی مسائل کو بڑی چابکدستی اور فنکاری کے ساتھ اپنی نظموں کا حصہ بناتے ہیں۔ ان کی قوت حرفی گرفت زندگی کے تمام مسائل کا احاطہ کرتی دکھائی دیتی ہے ان کی شعری قلم رو میں داخل ہونے والے موضوعات کو شواہد کی بنیادوں پر استوار کرتے

نظر آتے۔ کیسی خاص نظریے یا فکری آبیاری کرتے دکھائی نہیں دیتا۔ احساس کی شدت الفاظ کی ندرت کے بغیر بھی دلوں میں اترتی دکھائی دیتی ہے اور نظموں کے اختصار میں ایک جہان اسرار پوشیدہ دکھائی دیتا ہے۔ اور کہی پر چھوٹی چھوٹی نظموں میں زندگی کی صداقتوں کو بغیر لف و نشر کے بیان کرتے نظر آتے ہے۔ مشترکہ طور پر اکثر ان کی نظمیں سیاسی، تہزیبی اور سماجی شعور کی عکاس کرتی ہے۔ ان کی نظمیں ماضی کے ساتھ ساتھ عصرِ حاضر کی روشن سوچوں پر مشتمل ہے۔ شہزاد اپنے فن کو امن شانتی اور زندگی کی اعلیٰ اقدارِ حیات کی ترجمانی کرتا ہے۔ اور زندگی کو ان قوتوں سے اپنے رشتے کو استوار کرتا ہے۔ ان کی کہی پر محبوب کے خیال کی مانند لگتی ہے۔ نظمیں جو کسی نہ کسی عنوان سے آپ کا پیچھا ضرور کرتی ہے۔ اور اس کا کوئی نہ کوئی رُخ آپ کا تعاقب کرتا ہے۔ جس سے پیچھا چھڑانے سے لاکھ کوشش کیجیئے لیکن وہ خیالات و موضوعات کسی نہ کسی عنوان سے آپ کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ ادب چونکہ معاشرے کا آئینہ اور زندگی کے تمام رنگوں کا عکاس ہے۔ جو زندگی کے ان پہلوؤں سے دامن چھڑا نہیں سکتا۔ اردو ادب میں شاعری ایک ایسی ہی صنف ہے جو اپنے لاتعداد موضوعات کے ساتھ خواص و عام مقبول ہو۔ ہر شاعر اور ادیب اپنے عہد کی پیداوار ہوتا ہے اور اسکے خیالات و جذبات اور احساسات اپنے ہی ماحول میں بنتے، بگڑتے اور سنورتے ہیں۔ معاشرتی انتشار لوگوں کے مسائل کے ادراک کو انہوں نے گہری نظر سے دیکھا۔ ان کے نزدیک سائنس اور اس مشینی زندگی، اور مشین نما انسان کو انسانیت سے کاٹ کر رکھ دیا۔ اور بہیت سے موضوعات کو اپنی شاعری میں سمویا۔ حقیقت شناس ہے۔ ادب چونکہ زندگی کا آئینہ ہے۔ اور آپ کی نظمیں معاشرے کے اجتماعی شعور کی آئینہ دار ہے۔ فکری پہلوؤں سے تو ان کی نظموں میں ایک جہان آباد نظر تا ہے۔ وہی پر فنّی لحاظ سے فن کے بے مثال پہلوؤں کو مضبوط کرنے کے لیے تراکیب، تشہیاب و استعارات کا منفرد استعمال کرتے ہے۔ اور یوں کہنا بجا ہو گا کہ ان کی شعری دنیا ان کی اپنی مخصوص طرزِ فکر سے عبارت ہے۔ ان کے ہاں دکھ کا ہلکا سلگتا ہوا دیا سا معلوم ہوتا ہے۔ ان کے ہاں دبی دبی سی کیفیت دِکھتی ہے۔ اور وہ دکھ کہی ان کے ذاتی اور معاشرے کے بھی ہیں۔ انہوں نے لفظیات اور استعارے کے پیانے عشقیہ بھی رکھے۔ اور جسے پڑھ کر یوں محسوس ہوتا کہ جسے یہ قاری کے ہی ہو۔ محض مسائل، اور دوسری بہیت سی چیزیں ان کی نظموں میں ملتی ہیں۔ شاعر نے اپنی نظموں میں مضامین کے نئے نئے پہلو تلاش کیے۔ رموز عشق کی پیچیدگیوں، کو جس مہارت کے ساتھ نظموں کا حصہ بنایا وہ قابل رشک ہے۔ اور اپنے موضوعات میں واردات قلبی کو نہیں وسیع المطالعہ کے باعث اور گہری فکر کی بدولت موضوعات میں تنوع کے ساتھ ساتھ فنّی مہارت بھی نظر آتی ہے غزل کے ساتھ ساتھ نظم کی صنف میں بے کراں موتی دکھائی دیتے۔ جہاں پر غزل کو مقبولیت حاصل ہوئی اور وہی پر نظم بھی خاصی اہمیت کی حامل رہی۔ نظم

اپنے منطقی وجود، جمالیت معنی رکھتی ہے۔ اور اسکا فن اس بات کا تقاضا کرتا ہے۔ کہ وہ نئ منزلوں، نئ شعری صداقت کی کھوج اور نئے مفاہیم کے پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ جیسے کہ ایک مصرعہ دوسرے مصرعے سے اس طرح پیوست نظر آئے کہ مکمل معنوی حیثیت ظاہر ہو۔ جس طرح انسانی زندگی متنوع ہے۔ اور اس کے بے شمار پہلو ایسے ہی ہے جو نظم فی نفسہ انسانی جذبات کی عکاسی ہے۔ نظم اپنا ایک الگ مخصوص مزاج رکھتی ہے۔ دیگر اصناف کی طرح اس میں بھی سیاسی، معاشی، اخلاقی، فلسفہ وحکمت، تہزیب وتمدن، سماجی، مزہبی، حمد ونعت اور سائنسی موضوعات کی حامل ہے۔ جہاں پر ان کی نظمیں فکری لحاظ سے متنوع موضوعات کی حامل وہی پر فنّی محاسن سے بھی انفرادیت کی حامل ہے۔ عصری آگہی اور فکری بالغی نظر کی بدولت ان کی نظموں میں زندگی کی تلخ حقیقتوں کی کتاب کشائی تی ہے۔ انھوں نے اپنے احساسات و تجربات کونہایت ہنر مندی سے اپنی شعری تخلیقات کے پیرہن میں ڈھالا۔ جس میں فکر وجذبہ کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ ان کا ہر خیال اور ہر احساس انسیت کا پرتو لیے۔ لہذا ہر فن پارے کا کوئی نہ کوئی سماجی مقصد ضرور ہوتا۔ ان کی نظموں میں وہ گہرا سماجی شعور نظر آتا ہے۔ ان کی نظمیں شاعری کی انھی خصوصیات کی بدولت نہ صرف شاعری کی روایت میں بلکہ اُردو شاعری کی تاریخ میں بھی نمایاں مقام ومرتبہ عطا کیا۔ وہی پر ان کی فکر انسانی جذبات واحساسات کی سچی کہانی معلوم ہوتی ہے۔ جو دلچسپ اور معنی خیز انداز اپنائے ہوئے۔ شہزاد احمد اردو شاعری کا ایک معتبر حوالہ۔ جنہوں نے اپنے فکری وفنّی لحاظ سے نظم کی دنیا میں اپنا ایک الگ مقام بنایا۔ ان کا لہجہ صرف رومانوی ہی نہیں بلکہ توازن واستدلال مل کر اس کے لہجے کو حسن عطا کرتے ہے۔ اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے وہ ایک سوشل سائنٹسٹ کی طرح معاشرے کے اتار چڑھاؤ اور اس کی مختلف طبقات اور طبقات کی سرگرمیوں پر گہری نظر رکھتا ہو۔ اور خود پر بیٹے حالات و واقعات اور کبھی معاشرے سے لیے ہوئے اور کچھ فطرت سے چُنے ہوئے رنگ ان سب کا بیان ان کے ہاں نمایاں نظر آتا ہے۔ اور سوچ کو عام فہم اور فنّی محاسن برتتے ہوئے اس انداز سے پیش کرتے ہوئے یوں محسوس ہوتا جیسے قوسِ قزح کے رنگ بکھیرے ہو۔ لہذا مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ان کی شاعری احساسات کی نمایاں شاعری ہے۔ یہ احساس ان کے ہاں نظموں میں واضح ملتا ہے۔ ان کی مشترکہ شاعری خاص کر نظمیں ان کی سوچ اور ان کے سفر کی داستاں سناتی ہے۔ زندگی کے تجربات اور ایک نئ زندگی کا ملناسب کا فنّی پیرائے میں اظہار بڑی عمدگی سے کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی نظموں میں ان کے جذبات وافکار کی کثرت کے ساتھ ساتھ لوازماتِ شعر اور دیگر فنّی محاسن بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ اور ایک تخلیق کار الفاظ کر تراش خراش کر ہی خوبصورت انداز میں پیش کرتا ہے۔ ان کی نظموں کا فنّی حوالہ اپنی اہمیت کا حامل ہے۔ اور فکری رُخ اپنی جگہ اہم۔ ان کی نظمیں انسانیت کا درس دیتی ہے، تو کہیں پر سوالیہ انداز اپنائے اور محبت کے

شریں بیان ساتھ ساتھ سائنسی، سماجی اور غم و خوشی کے لمحات، اور دیگر موضوعات سمیٹے ہوئے ہے اپنے اندر۔ رومانویت، دردمندی، حبُ الوطنی، ماشرہ اس کے مسائل اور فطرت نگاری، منظر کشی، انکی نظموں کی پہچان ہے۔ جو ان کو اپنے معاصرین میں مثبت اور منفرد مقام دلاتی ہے۔ ان کی نظمیں محبتوں، صداقتوں، پُر خلوص جذبوں اور فطرت نگاری و سائنسی شعور پر مبنی اور روایات کی ترجمان ہے۔ اور ہمیشہ زندہ رہیں گی۔

مصادر و مراجع

بنیادی مآخذ

۱. شہزاد احمد، اربوں سال کی دوری، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء

۲. شہزاد احمد، ایک چراغ اور بھی، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء

۳. شہزاد احمد، ٹوٹا ہوا پل، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء

۴. شہزاد احمد، دیوار پہ دستک، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء

ثانوی مآخذ

۱۔ احتشام حسین، نظم میں نئی سمتیں، اور اُردو ادب کی نئی تاریخ، دہلی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۸ء

۲۔ اسد عباس عابد، غزل گو شہزاد احمد، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۸ء

۳۔ اسلم انصاری، ڈاکٹر، اُردو شاعری میں المیہ تصورات، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۲۰۰۸ء

۴۔ اشفاق احمد ورق، ڈاکٹر، خود ستائیاں، لاہور: بیت الحکمت، ۲۰۰۵ء

۵۔ اعجاز حسین، ڈاکٹر، اردو شاعری کا سماجی پس منظر، الہ آباد، کارواں پبلشرز، ۱۹۶۸ء

۶۔ آغا بابر، خدوخال، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء

۷۔ افتخار شفیع، اصناف شاعری، لاہور: کتاب سرائے، ۲۰۱۱ء

۸۔ افسر ساجد، سید، تذکرے اور تجزیے، لاہور: بکس اینڈ ریڈرز، ۲۰۰۲ء

۹۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۰۴ء

۱۰۔ انور سدید، ڈاکٹر، بیسویں صدی کی اردو شاعری، لاہور: مقبول اکیڈمی، ۲۰۰۶ء

۱۱۔ انور سدید، ڈاکٹر، جدید اردو نظم کے اربابِ اربعہ، لاہور: مقبول اکیڈمی، ۲۰۰۶ء

۱۲۔ انیس ناگی، نیا شعری افق، لاہور: پوسٹ بکس، ۱۹۶۹ء

۱۳۔ اے۔بی اشرف، ڈاکٹر، کچھ نئے اور پرانے شاعر، لوہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء

۱۴۔ بشریٰ صادق، ڈاکٹر، گلہائے تازہ، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۶ء

۱۵۔ تحسین فراقی، ڈاکٹر، افادات (شعری مطالعات)، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء

۱۶۔ جیلانی کامران، نئی نظم کے تقاضے، لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۸۵ء

۱۷۔ حبیب اللہ خان غضنفر، پروفیسر، زبان و ادب، لاہور: بک ٹاک، ۲۰۰۳ء

۱۸۔ حنیف کیفی، ڈاکٹر، اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء

۱۹۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، نئی نظم کا سفر، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ، ۱۹۷۶ء

۲۰۔ خواجہ اکرام، ڈاکٹر، اُردو کی شعری اصناف، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ، ۱۹۹۹ء

۲۱۔ خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر، انتخابِ زریں اُردو نظم، لاہور: سنگت پبلشرز، ۲۰۱۵ء

۲۲۔ ساجد امجد، ڈاکٹر، اُردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء

۲۳۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، ادب اور کلچر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء

۲۴۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، پاکستانی شاعرات، تخلیقی خدوخال، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء

۲۵۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، تنقیدی دبستان، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء

۲۶۔ سنبل نگار، ڈاکٹر، اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ، لاہور: زبیر بکس اُردو بازار، س ن

۲۷۔ سہیل احمد، ڈاکٹر، طرفیں، لہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء

۲۸۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، ادب و فن، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۸۷ء

۲۹۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، سخن ور_ نئے اور پرانے (منتخب مضامین)، لاہور: اردو اکیڈمی پاکستان، ۲۰۱۵ء

۳۰۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، ولی سے اقبال تک، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء

۳۱۔ شاہین مفتی، ڈاکٹر، جدید اردو نظم میں وجودیت، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء

۳۲۔ شمیم حنفی، جدیدیت اور نئی شاعری، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء

۳۳۔ شمیم حنفی، نئی شعری روایت، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ، ۱۹۷۸ء

۳۴۔ شہزاد احمد، گرد چیف معجزے کی تلاش میں، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء

۳۵۔ شہزاد احمد، ذہنِ انسانی حدود اور امکانات،، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء

۳۶۔ شوکت مغل، اِفادات، ملتان: جھوک پبلیشر، ۲۰۰۴ء

۳۷۔ صائمہ شمس، ڈاکٹر، اردو غزل میں مرگ وحیات کا تصور، پاکستان: ادارہ فروغ قومی زبان، ۲۰۱۲ء

۳۸۔ ضیاءالحسن، ڈاکٹر، جدید اُردو نظم آغاز وارتقا، لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء

۳۹۔ طارق ہاشمی، ڈاکٹر، اُردو نظم اور معاصر انسان، اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۵ء

۴۰۔ طارق ہاشمی، جدید نظم کی تیسری جہت، لاہور: دستاویز مطبوعات، ۲۰۰۳ء

۴۱۔ طاہر تونسوی، ڈاکٹر، ہم سخن فہم ہیں، لاہور: یونیورسل بکس، ۱۹۸۹ء

۴۲۔ عابد علی عابد، سید، اسلوب، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء

۴۳۔ عارف ثاقب، انجمن پنجاب کے مشاعرے، لاہور: الوقار پبلشرز، ۱۹۹۵ء

۴۴۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، جدید اُردو شاعری، لاہور: اُردو دنیا، ۱۹۶۱ء

۴۵۔ عبد العزیز ملک، تعبیر و تفہیم، فیصل آباد، مثال پبلشرز، ۲۰۱۷ء

۴۶۔ عطش درانی، ڈاکٹر، اصطلاحی جائزے، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۸ء

۴۷۔ عقیل احمد صدیقی، جدید اردو نظم نظریہ و عمل، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۷۰ء

۴۸۔ علی عباس جلالپوری، عام فکری مغالطے، لاہور: تخلیقات، س ن

۴۹۔ علی محمد خاں، ڈاکٹر، لاہور کا دبستانِ شاعری، لاہور: نشریات، ۲۰۰۸ء

۵۰۔ غفور شاہ قاسم، پاکستانی ادب شناخت کی نصف صدی، راولپنڈی: رمیز پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء

۵۱۔ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، اردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء

۵۲۔ فتح محمد ملک، انداز نظر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشز، ۱۹۹۹ء

۵۳۔ فتح محمد ملک، خیال و خواب، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء

۵۴۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اُردو شاعری کا فنّی ارتقا، الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء

۵۵۔ قاسم یعقوب، اُردو شاعری پر جنگوں کے اثرات، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۱ء

۵۶۔ کوثر مظہری، جدید نظم حالی سے میراجی تک، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء

۵۷۔ گیان چند جین، ڈاکٹر، ادبی اصناف، گاندھی نگر: گجرات اردو اکادمی، ۱۹۸۹ء

۵۸۔ محسن عباس، ڈاکٹر، وزیر آغا کی نظم نگاری، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۴ء

۵۹۔ محمد افتخار شفیع، اصنافِ شاعری، لاہور: کتاب سرائے، ۲۰۱۱ء

۶۰۔ محمد حسن، ڈاکٹر، جدید اردو ادب، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ، ۱۹۷۵ء

۶۱۔ محمد حسن، ادبیات شناسی، نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، ۲۰۰۰ء

۶۲۔ محمد حسین آزاد، مولانا، آب حیات، لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۰ء

۶۳۔ مزمل حسین، ڈاکٹر، ادبی مطالعات، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۰ء

۶۴۔ ملک مقبول احمد، ذوقِ نظر، لاہور: مقبول اکیڈمی، ۲۰۱۳ء

۶۵۔ نیر صمدانی، ڈاکٹر، اعتبارات، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء

۶۶۔ وحید احمد، نظم نامہ، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۶ء

۶۷۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، نئے مقالات، سرگودھا: مکتبہ اردو زبان، ۱۹۷۶ء

۶۸۔ وہاب اشرفی، پروفیسر، تفہیم البلاغت، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۵ء

لغات

۱. سید احمد دہلوی، خان صاحب، مولوی، فرہنگ آصفیہ، نئی دہلی: ترقی اُردو بیورو، ۱۹۱۲ء

۲. شان الحق حقی، فرہنگ تلفظ، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۸ء

۳. عبدالحمید، جامع اللغات، لاہور: اُردو سائنس بورڈ، ۲۰۱۰ء

رسائل و جرائد

۱. روزنامہ پاکستان

۲. روزنامہ جنگ

۳. روزنامہ نوائے وقت

Websites

1. www.kitabghar.com

2. www.rekhta.org

ضمیمہ جات

۱۶/ اپریل ۱۹۳۲، ۱۱ اگست ۲۰۱۲

آدھ کھلا
دریچہ

دیوار پہ دستک
شہزاد احمد
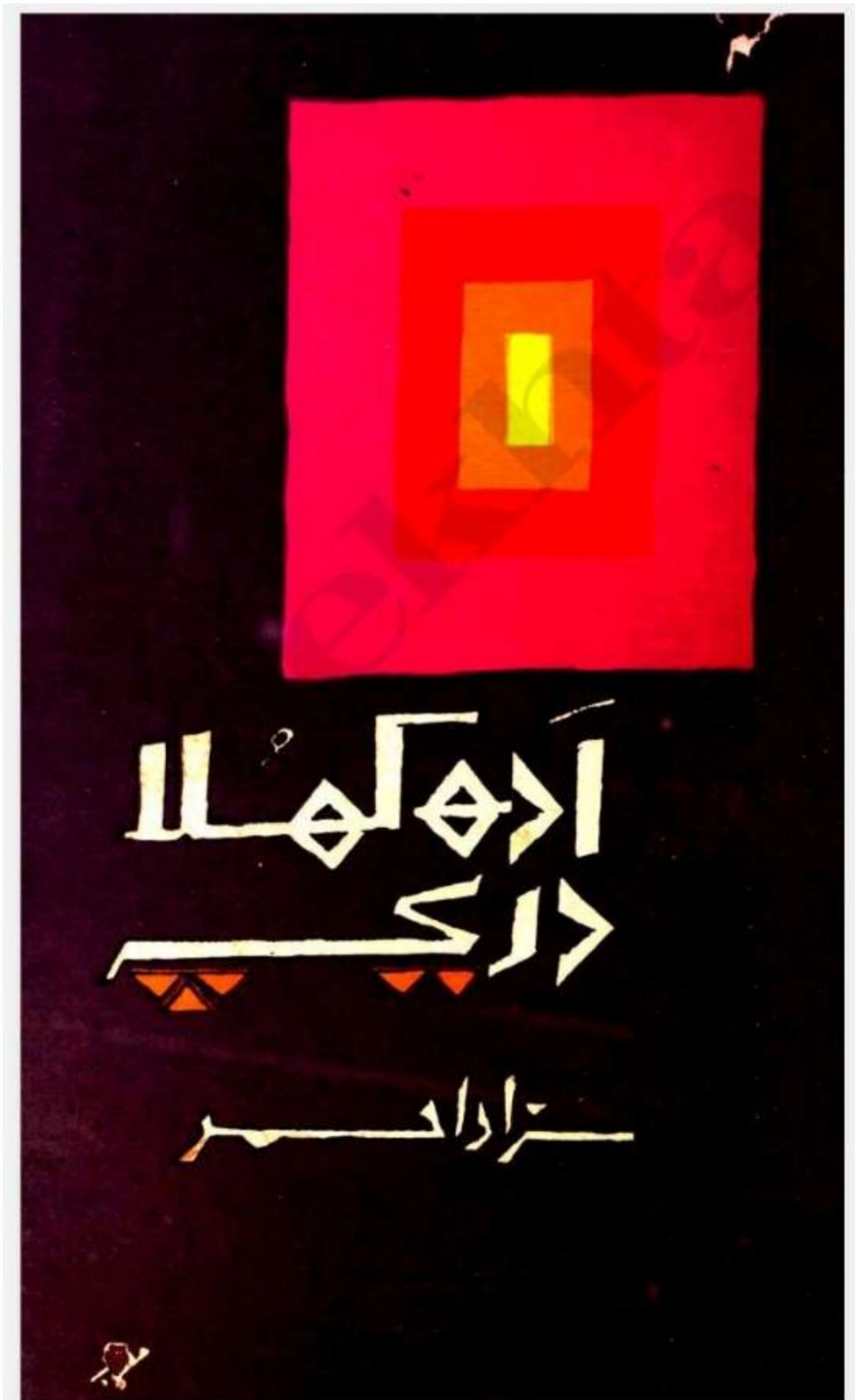
ٹوٹا ہوا پل
شہزاد احمد

اربوں سال کی دُوری
شہزاد احمد

ایک چراغ اور بھی
شہزاد احمد